فہرست ششماہی

مضامینِ معارف

ماہ جولائی ۲۰۰۸ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۸ء

۱۸۲ ویں جلد

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون	صفحات
	شذرات	۸۲،۲
		۲۴۲،۱۶۲
		۴۰۲،۳۲۲
	مقالات	
	اقبال کے نظریہ شعر کی روشنی میں چند معروضات	۵۷
	بسملہ آیات قرآنی میں	۲۶۱،۱۶۵
	تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل	۳۵۴،۲۷۵
	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا نشان دہندہ۔نواب ظہور اللہ خاں نوا بدایونی	۴۲۹
	ذہن اور دماغ کے مابین تعلق کی نوعیت	۳۶۶
	رسالت محمدیؐ اور مغرب کا معاندانہ رویہ	۸۵
	روداد شاہ ولی اللہ سمینار	۴۶۲
	سیر الاولیاء	۲۹۰
	عراق	۲۱۵،۱۱۳
	عربی قصہ نگاری - مختصر تعارف	۴۳

نمبر شمار	مضمون	صفحات
	عصر رواں میں شبلی کی معنویت	۳۳۹
	علم مصطلح حدیث۔تاریخ وتعارف	۱۸
	قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات	۵
	قرآن عظیم اور کائناتی مخلوق	۴۰۵
	قصہ قارون کے بعض اہم پہلو	۲۰۱
	ماحولیاتی بحران، اسباب وعلاج	۲۳۶،۱۸۰، ۳۲۵
	مکتوبات امام ربانی، اعلا عربی زبان وادب کی مثال	۱۳۴
	مولانا آزاد کی انقلابی فکر کا تشکیلی دور	۴۴۸
	مولانا سعید انصاری نشتر	۱۰۰
	مولانا فراہیؒ کے دو غیر مطبوعہ خطوط	۲۲۶
	اخبار علمیہ	۱۴۶،۶۴
		۳۰۶،۲۳۳
		۳۵۹،۳۸۴

نمبر شمار	مضمون	صفحات
	معارف کی ڈاک	
	مکتوب بہار	۴۶۵
	مکتوب پٹنہ	۱۵۰
	مکتوب خالص پور	۱۵۱
	مکتوب دہلی	۶۹
	مکتوب دہلی	۲۳۵
	مکتوب علی گڑھ	۶۷
	مکتوب علی گڑھ	۱۴۹
	مکتوب عمر آباد	۶۹
	مکتوب گورکھ پور	۳۰۹
	وفیات	
	آہ! پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی مرحوم	۷۱
	آہ! ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا	۲۳۷
	پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد	۳۸۷
	جناب الحاج منظور علی لکھنوی مرحوم	۳۱۲
	جناب صلاح الدین اویسی مرحوم	۳۱۰

نمبر شمار	مضمون	صفحات
	آثار علمیہ و تاریخیہ	
	ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نام اہل علم کے خطوط	۳۹۰، ۴۶۷
	باب التقریظ والانتقاد	
	تاریخ اولیائے گجرات	۴۷۲
	رول آف مسلمس	۱۵۳
	ادبیات	
	آہ! مولانا ضیاء الدین اصلاحی	۷۴
	رفعت در جنت نذیر نیک دل	۴۷۸
	ضیاء الدین اصلاحی	۱۸۵
	قرآن ہے سرچشمہ......	۳۹۵
	نعت نبی	۳۱۴
	مطبوعات جدیدہ	۷۵، ۱۵۹، ۲۳۹، ۳۱۵، ۳۹۶، ۴۷۹
	اشتہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی	۲۴۰

فہرست ششماہی

مضمون نگاران معارف

ماہ جولائی ۲۰۰۸ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۸ء

۱۸۲ ویں جلد

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱	ڈاکٹر ابرار احمد اعظمی، خالص پور اعظم گڈھ	۷۴، ۱۵۱
۲	جناب ابو البیان حماد عمری، جامعہ دار السلام، عمر آباد	۶۹
۳	پروفیسر احتشام ندوی، مدینہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ	۱۴۹

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۴	ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، ۵۹۸/۹، ذاکر نگر نئی دہلی	۳۹۵
۵	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ناظم دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ	۸۳، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲
۶	پروفیسر اقبال حسین ندوی، سیفل، حیدر آباد	۴۳
۷	جناب اورنگ زیب اعظمی، لکچرر (گیسٹ) سنٹر فار عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز اسکول آف لینگویجز، جواہر لال یونی ورسٹی، نیو دہلی	۱۳۴
۸	(ڈاکٹر) بدر الدین الحافظ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی	۲۳۵
۹	ڈاکٹر جاوید علی خاں، صدر شعبہ تاریخ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڈھ	۱۵۳
۱۰	جناب حکیم محمد سعید، ہمدرد اسلاکس، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن پاکستان ناظم آباد کراچی پاکستان	۴۶۹
۱۱	جناب حنیف نجمی، فیصل ولاء نیا پارہ نگر، دھمتری، چھتیس گڑھ	۲۰۱
۱۲	جناب رضی الدین صدیقی، پاکستان اکیڈمی آف سائنسز اسلام آباد پاکستان	۴۷۱
۱۳	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ	۳۱۴
۱۴	مولانا سعید الرحمان ندوی، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور	۵، ۴۰۵
۱۵	ڈاکٹر شمس بدایونی، ۵۸، نیو آزاد پورم کالونی، عزت نگر، بریلی	۴۲۹ ۱
۱۶	سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم، ناظم دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ	۴۷۰
۱۷	مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ناظم دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ	۴۷۰
۱۸	جناب ضیاء الرحمان اعظمی، تکیہ اعظم گڈھ	۷۳
۱۹	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ	۶۷، ۲۲۶
۲۰	ڈاکٹر سید عبد الباری، ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر، یوپی	۳۳۹
۲۱	پروفیسر عبدالحق، دہلی یونی ورسٹی، دہلی	۴۴۸
۲۲	ڈاکٹر عبد الکریم نائک، ڈونگری کلینک ۲۲، جیل روڈ، ڈونگری، ممبئی	۶۸
۲۳	جناب سید عبد الماجد غوری ریسرچ اسکالر، مرکز بحوث و تحقیق، دار ابن کثیر، دمشق	۱۸
۲۴	مولانا عبد المبین ندوی جامعہ ریاض العلوم، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی	۶۹
۲۵	عمیر الصدیق ندوی	۲، ۷۱، ۷۵

معارف

جولائی ۲۰۰۸ء

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔ (ہند)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
		۱۹۵، ۲۳۷، ۲۳۹، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۵، ۳۹۶، ۴۶۲، ۴۷۹
۲۶	جناب غلام حسین بابر، لیکچرر ایرانی زرعی یونیورسٹی راول پنڈی	۸۵
۲۷	جناب فیروز الدین احمد فریدی، کھتوال ہاؤس اے-۵۴، اسٹریٹ، ۱۵-باتھ آئی لینڈ، کراچی، پاکستان	۲۹۰
۲۸	مولانا قمر الدین اصلاحی (قمر اعظمی) سہریا نظام آباد اعظم گڈھ	۱۵۸
۲۹	کلیم صفات اصلاحی رفیق دارالمصنفین	۶۴، ۱۱۳، ۱۴۶، ۲۱۵، ۲۳۳، ۳۰۶، ۳۵۴، ۴۶۲
۳۰	جناب مالک رام صاحب سی ۳۹۶، ڈیفنس کالونی نئی دہلی	۳۹۰
۳۱	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج، اعظم گڈھ	۱۰۰
۳۲	جناب محمد حسن عسکری صاحب این ۴۷/۷، سمن آباد، لاہور-۴	۳۹۲
۳۳	ڈاکٹر خواجہ محمد سعید صاحب شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب لاہور	۳۶۶
۳۴	جناب محمد شفیع صاحب ۲۴ ریمسن روڈ، لاہور	۳۹۲

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۳۵	ڈاکٹر محمد عتیق الرحمان، عالمی رابطہ ادب اسلامی، بہار شاخ	۱۵۰
۳۶	جناب محمد معتصم عباسی، محلہ نظام پور، گورکھ پور	۳۰۹
۳۷	پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ	۱۶۵، ۲۶۱
۳۸	جناب محمد یحییٰ جمیل صاحب لیکچرر شعبہ فارسی، شریمتی کیشر بائی لاہوٹی مہاودیالیہ، امراوتی	۵۷
۳۹	ڈاکٹر محمد حسن الہ آبادی، بی-۴۰۴، بدر منزل، پٹیل نگر دی پی ناکہ، بھیونڈی (تھانے)	۴۷۲
۴۰	ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ	۳۸۷
۴۱	پروفیسر سید مسعود احمد، شعبہ بایوکیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ	۱۸۰، ۲۴۶، ۳۲۵
۴۲	پروفیسر مسعود الحسن، سابق صدر شعبہ انگریزی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ	۲۷۵
۴۳	جناب ہارون خاں شیروانی مصطفیٰ منزل، حمایت نگر حیدرآباد دکن	۴۶۷
۴۴	جناب وارث ریاضی صاحب کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن بہار	۴۶۷، ۴۷۸

زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

ہندوستان میں ۸ سال کی خریداری صرف =/1,000 میں دستیاب ہے

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۷۶ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ---- Phone: (009242) 7280916 5863609

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- ماخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۲ ماہ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۰۸ء عدد ۱

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات ۲
عمیر الصدیق ندوی

مقالات
قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات ۵
مولانا سید الرحمان ندوی
علم مصطلح حدیث - تاریخ و تعارف ۱۳
جناب سید عبد الماجد غوری
عربی قصہ نگاری - مختصر تعارف ۴۳
پروفیسر اقبال حسین ندوی
اقبال کے نظریہ شعر کی روشنی...... ۵۷
جناب محمد یحییٰ جمیل صاحب

اخبار علمیہ ۶۴
ک ص اصلاحی

معارف کی ڈاک
مکتوب علی گڑھ ۶۷
پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
مکتوب ممبئی ۶۸
ڈاکٹر عبد الکریم نائک
مکتوب عمر آباد ۶۹
جناب ابو البیان حماد عمری
مکتوب دہلی ۶۹
مولانا عبد المبین ندوی

وفیات
آہ! پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی مرحوم ۷۱
ع-ص

ادبیات
نذرانہ عقیدت ۷۳
جناب ضیاء الرحمان اعظمی
آہ! مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۷۴
ڈاکٹر ابرار احمد اعظمی

مطبوعات جدیدہ ۷۵
ع-ص۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

معارف کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۱۶ء میں نکلا تھا یعنی اب اس جولائی ۲۰۰۸ء سے اس کی زندگی کا بانواں سال شروع ہوتا ہے، قریب ایک صدی کی اس مدت میں خدا جانے اردو کے کتنے اور کیسے کیسے رسالے شروع ہوئے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں ''کتنے کاغذ کے پتلے، عرصہ وجود میں آئے اور فنا ہوگئے'' اللہ تعالیٰ نے معارف کو یہ زندگی اور توانائی بخشی تو یہ صرف اس کا کرم بے پایاں ہے کہ اس نے علامہ شبلیؒ اور ان کے قابل فخر شاگردوں اور ان کے علمی وارثوں کی نیت اور عمل کو حسن قبول بخشا اور ان کے ذریعہ معارف کو اس مقام تک پہنچایا کہ اس نے علم و تحقیق و ادب کے ساتھ حرارت ایمانی بڑھانے کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی، فالحمد للہ علی ذلک۔

ایک صدی کی مدت کم نہیں ہوتی، کار تجدید کے لیے یہ بھی ایک پیمانہ ہے، معارف نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب مغرب کے سیاسی، فکری اور علمی تسلط کا غلغلہ ہر چہار طرف تھا، وقت کے ساتھ مغربی استعمار کی حدیں سمٹیں لیکن عسکری قوت کی بجائے جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات کی مدد سے مغرب اور اسی کی شاخ امریکا نے استعمار کی نئی اصطلاحیں وضع کیں اور خدا کے آزاد بندوں کی دنیا سیاست اور معیشت کے نئے دام میں گرفتار ہوئی، قریب سو سال ہونے پر معارف کے سامنے اب بھی وہی مسائل ہیں بلکہ اب حالات پہلے سے زیادہ سنگین اور سخت ہیں، وہ رجال کار ہیں، نہ قوم کا وہ مذاق علم و ادب ہی نظر آتا ہے، لیکن ایک حقیقت ضرور ہے اور ڈھارس بھی اسی سے ہے کہ جس راستے کو وابستگان شبلی نے سمجھ بوجھ کر ایک دفعہ صحیح مانا، کاروان شبلی و سلیماں کے آج کے مسافر اسی پر گام زن ہیں، پیش رو صاحبان معارف نے اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ معارف کی غرض و غایت دین کی راہ سے علم کی یا علم کی راہ سے دین کی خدمت ہے۔

معارف کا بچپن یورپ کی اس جنگ میں گزرا جو پہلی جنگ عظیم کے نام سے دنیائے انسانیت کی تاریخ میں رسوا ہے، اب اس عمر میں اس کے سامنے دہشت گردی کے نام سے مظلوم کو ظالم اور ظالم کو مظلوم بنانے کی جنگ ہے، اس جنگ میں طبل و علم ان ہی کے ہاتھوں میں ہے جن کی ساری تاریخ اقوام

کی غارت گری سے عبارت ہے، نسلی غرور و تکبر اور دنیا کے تنہا مالک و وارث کا سودا سر میں سمائے اور انسان کی معیشت و اقتصاد کو ہمیشہ سے سود و قمار کے ذریعہ برباد کرنے والے یہود نے جس مکر و فریب سے اپنے ہی کشتہ ستم نصاریٰ کو گذشتہ کئی صدیوں سے استعمال کیا ہے، اس کا نشانہ ظاہر ہے اسلام اور اس کا پیغام اور اس کے پیروکار ہیں، موجودہ دہشت گردی کا فسانہ ان کے لیے تجریدی و علامتی نہیں جن کی نظر پلاٹ، کردار اور پس منظر پر ہے، چنانچہ درد کے حد سے گزرنے کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں گذشتہ دنوں ایسی متعدد آوازیں بلند ہوئیں جن سے مظلوم کی مظلومیت اور مسلمانوں کے خلاف علی الاطلاق دہشت گردی کے الزام کی مذمت ظاہر کی گئی، قطع نظر اس کے کہ یہ آوازیں اور یہ جوش مدافعانہ ہے یا کچھ اور، کانفرنسوں اور جلسے جلوسوں کا مقصد اسی وقت کامیاب ہے جب ان میں استقلال اور مضبوطی ہو، یہ نہ ہو کہ آج ایک بات اٹھائی گئی اور کل وہ بھلا دی گئی، ہمارے بزرگوں کی تلقین یہی رہی ہے کہ جو بات جماعتی و اجتماعی حیثیت سے نکلے اس کو کر کے چھوڑا جائے تاکہ حوصلہ، ہر قدم کو آگے بڑھائے اور زندگی کا سرچشمہ جوش مارتا رہے، کسی مورچے پر جم کر لڑنے کے مادے سے شاید اب تک ہماری قوم محروم ہے۔

معارف کی بنیاد میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ جو دوسرا ہاتھ برابر کا شریک تھا وہ علامہ شبلی کے ایک اور عزیز شاگرد اور ان کے طرز نگارش کے متبع مولانا عبدالسلام ندویؒ کا تھا، تاریخ، تذکرہ نگاری، ادب، تحقیق، تنقید اور شاعری میں مولانا مرحوم کے مرتبہ بلند کا تقاضا تھا کہ ان کی قابل رشک و تقلید خدمات کو تازہ و زندہ کیا جائے، اسی مقصد سے ان کے عزیز قریب جناب محمد ہارون کی سعی و کاوش سے مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی کے زیر اہتمام اور جامعۃ الفلاح کے تعاون و اشتراک سے مارچ میں ایک وسیع مذاکرہ علمی کا بلریا گنج اعظم گڈھ میں انعقاد کیا گیا، مذاکرے کا عنوان ''مولانا عبدالسلام ندوی کی دانش وری اور عصر حاضر'' تھا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی آرزو بھی اس میں شامل تھی لیکن مشیت ایزدی کہ وہ اس میں خود شامل نہ ہو سکے، تاہم پروفیسر عبدالحق، پروفیسر کبیر احمد جائسی، جناب شمیم طارق اور مختلف علمی و تعلیمی اداروں کے نمائندوں کی شرکت سے اس سمینار کو وقار حاصل ہوا، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی دو کتابوں ''مشرقی کتب خانے'' اور ''مولانا کاتبی نیشاپوری'' کے علاوہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی کتاب ''مولانا عبدالسلام ندوی ماہر قرآنیات و ادبیات'' کی رونمائی بھی ہوئی، معارف میں بہ وجوہ، وقت پر اس کا ذکر نہیں آسکا، مولانا ندوی مرحوم کی دانش وری اور ان کی یاد

یوں بھی عصر اور وقت کی حدوں سے ماورا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعض نوجوان، اپنے اسلاف کرام کی طرح بیرون ہند خصوصاً عالم عرب میں علوم اسلامیہ کی خدمت سے خود کا اور اپنے بزرگوں کا نام روشن کررہے ہیں، سید عبدالماجد غوری حیدرآبادی ندوی ان میں سے ایک ہیں، انہوں نے دمشق شام سے دارالمصنفین اور معارف کے لیے اپنی چار تالیفات ”معجم المصطلحات الحديثيه“، ”معجم الفاظ و عبارات الجرح و التعديل، المشهوره والنادره، المدخل الى دراسة علم الجرح والتعديل اور علم الرجال، تعريفه و كتبه“ بھیجی ہیں، ان کتابوں کے ناموں سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حدیث شریف کے فن جرح و تعدیل، مصطلحات اور علم رجال کے تعلق سے مطالعہ و تحقیق اور تعلیق و تدوین کی سعادت آں عزیز کو حاصل ہوئی، ہزاروں صفحات پر مشتمل یہ موسوعاتی کارنامہ ایک حوصلہ مند نوجوان کے بلند عزائم کی خوب صورت تصویر ہے، دمشق و بیروت کے بلند ترین طباعتی معیار پر یہ کتابیں نہایت دیدہ زیب ہیں، ان کے مشمولات کا تعارف معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں انشاءاللہ آئے گا، اس وقت تو ہم عزیز موصوف کو ان کے ان کارناموں کے لیے ہدیہ تبریک و تحسین پیش کرتے ہیں، اللھم زد فزد۔

افسوس ہے کہ گذشتہ دنوں ہماری علمی و ادبی اور سیاسی دنیا کا خلا کچھ اور بڑھا، حیدرآباد کے پروفیسر افضل الدین اقبال ۱۵ رمئی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے، عثمانیہ یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو اور اس سے زیادہ دکنی ادب کے ماہر کی حیثیت سے ان کی شہرت تھی، جنوبی ہند کی صحافت، مدراس میں اردو ادب کی نشوونما، فورٹ سینٹ جارج کالج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے علمی ادارے ان کی اہم کتابیں تھیں، دوسری اہم شخصیت غلام محمود بنات والا کی ہے، وہ پارلیمنٹ کے ممتاز اور پرانے ممبر تھے، ہندوستان میں مسلم لیگ کا نام زندہ رکھا اور اپنے کردار سے غیروں سے بھی عزت حاصل کی، ملت اسلامیہ ہندیہ کے مسائل پر بے باکی اور نہایت حکمت اور دانائی سے اظہار خیال کرتے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

ناظم دارالمصنفین اور مدیر معارف جناب اشتیاق احمد ظلی، اپنی ایک مامی کے انتقال اور دوسرے ماموں کی سخت علالت کی وجہ سے شذرات کے لیے وقت نہیں نکال سکے، ان کے سکون خاطر کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔

مقالات

قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات

مولانا سعید الرحمان ندوی

(۲)

ساتوں آسمانوں میں صرف زمینوں کی تخلیق کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے ان کے مراکز سورجوں کی بھی جس واجبی تخلیق کی لفظی صراحت کو اب تک محذوف و مقدر رکھا گیا تھا اب اسے وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (اور ہم نے قریبی آسمان کو بھی کچھ چراغوں سے آراستہ کیا ہے) کے ذریعے نہایت معنی خیز انداز میں ظاہر کرتے ہوئے یہ سبق دیا جارہا ہے کہ یہاں شروع ہی سے کلام، کائنات کی کل زمینوں اور ان کے متعلقہ سورجوں کے تناظر میں ہورہا ہے، اس طرح اس تعلق سے اوپر بیان کردہ ہمارے علمی و عقلی دلائل عین مطابق نقل و شرع ٹھہر جاتے ہیں، نیز اس وقت تعبیر کا یہ حکیمانہ فرق بھی ملحوظ رہے کہ شروع میں اگر ساتوں آسمانوں میں سورجوں کو مقدر کرتے ہوئے صرف ان کی ماتحت زمینوں کا تذکرہ کیا گیا تھا تو اب اس کے برعکس آخر میں موجودہ فقرے کے ذریعے ہمارے پہلے آسمان میں صرف سورجوں کا ذکر کرتے ہوئے پہلے ہی سے ثابت شدہ زمینوں کو مقدر کردیا گیا ہے، لہٰذا اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ قرآن حکیم جس طرح صرف چاندوں کے وجود سے ان کے مراکز زمینوں کے یقینی وجود پر دلیل قائم کرتا ہے ٹھیک اسی طرح کبھی صرف سورجوں کے ذکر سے ان کی متعلقہ زمینیں بھی مراد لیتا ہے اور کبھی محض زمینوں کے بیان سے ان کے مراکز سورجوں کے بھی مراد ہونے پر دلیل قائم کرتا ہے۔

مزید برآں یہاں (مَصَابِيحَ) پر دوبارہ غور کیا جائے جو ”الف لام“ کے بغیر بہ طور نکرہ

فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

واقع ہو کر خبر دے رہا ہے کہ دنیوی آسمان میں موجود سورجوں کی تعداد میں استغراق مقصود نہیں ہے، چنانچہ یہاں جس قدر بھی سورج موجود ہیں وہ کل نہیں ہیں، یاد رہے کہ (سِرَاجٌ) اور (قمرٌ) کو اسی طرح نکرہ کے طور پر لاکر ٹھیک یہی سبق دیا جاچکا ہے، جب کہ انہیں "الف لام" کے ساتھ بہ طور معرفہ دہرا کر یہ فائدہ پہنچایا گیا تھا کہ استغراق کے ساتھ کل سورجوں، چاندوں اور زمینوں کا وجود ساتوں آسمانوں میں ہے، اسی لیے سارے آسمانوں میں پھیلائی گئی ان بے شمار زمینوں کی تخلیق میں پنہاں باری تعالیٰ کی اس عظیم حکمت و مصلحت اور بے نظیر منصوبہ بندی کا اظہار (ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ) (یہ ہے ہمہ قوت اور ہمہ علم ذات کا اندازہ) کے ذریعے کیا جارہا ہے۔

اس وقت یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ یہاں (فَقَضَاهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ) کے ذریعے جس طرح زمینوں کو دو دن میں ساتوں آسمانوں میں درست کردیے جانے کا سبق دیا جارہا ہے، اس مفہوم میں پہلے خود ان آسمانوں کو سابقہ دھوئیں والی حالت سے موجودہ ہیئت میں متشکل کیا جانا بھی شامل ہے، جیسا کہ ایک اور موقع سے زمینوں کا آسمانوں کی تخلیق کے بعد ہی بچھایا اور پھیلایا جانا مذکور ہوا ہے:

۶- أَأَنۡتُمۡ أَشَدُّ خَلۡقًا أَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰهَا وَأَغۡطَشَ لَیۡلَهَا وَأَخۡرَجَ ضُحٰهَا وَالۡأَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا (نازعات: ۲۷-۳۰)

بھلا تمہیں پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمانوں کا جنہیں اس نے بنایا ہے؟ اس نے ان کی چھت بلند کی اور انہیں ٹھیک ٹھاک کیا اور ان کی راتوں کو تاریک کیا اور ان کے دنوں کو ظاہر کیا اور زمینوں کو اس نے انہیں اس کے بعد ہی پھیلایا ہے۔

چنانچہ یہاں سب سے پہلے آسمانوں کی تخلیق کی خبر دینے کے بعد ہی (وَالۡأَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا) کے ذریعے یہ بتایا جارہا ہے کہ زمینوں کو پھیلایا گیا ہے، نیز یہاں ان دونوں بیانات کے عین وسط میں (وَأَغۡطَشَ لَیۡلَهَا وَأَخۡرَجَ ضُحٰهَا) کے ذریعے یہ بھی خبر دی گئی کہ ان کی درمیانی ایک کڑی اور بھی ہے، چنانچہ باری تعالیٰ نے جب ان آسمانوں کی راتوں کو تاریک اور دنوں کو روشن بھی بنایا ہے تو اس سے بہ خوبی مستنبط ہوتا ہے کہ لیل و نہار کی اس تخلیق سے اشارہ حقیقتاً سورجوں

کی تخلیق ہی کی جانب ہے، جن کے بغیر ان کا آنا جانا ناممکن ہے، اس طرح زمینوں کی تخلیق سے قبل ہی ان کے مراکز سورجوں کی تخلیق بھی منصوص طور پر ثابت ہو جاتی ہے، چنانچہ اس سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آسمانوں کی تخلیق کی گئی تھی، پھر سورجوں کی اور ان کے بعد زمینوں کی اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ آیت سابقہ آیتوں میں موجود ظاہری ابہام کی توضیح و تشریح کرنے والی اور وہاں ہمارے اخذ کردہ مفہوم کو مزید مضبوط و مستحکم کرنے والی بھی ہے، چنانچہ اس مفہوم کی مزید تائید و تقویت حسب ذیل آیت کریمہ اس طرح کرتی ہے:

۷- اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الۡأَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الۡأَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ لِتَعۡلَمُوۡآ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ وَّأَنَّ اللّٰهَ قَدۡ أَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا (طلاق: ۱۲)

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور ان ہی کی طرح زمینیں بھی، ان میں حکم نازل ہوتا رہتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کا علمی اعتبار سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔

یہی ہے وہ آیت کریمہ جس سے استشہاد کرتے ہوئے دور قدیم ہی سے مفسرین کی ایک بڑی جمعیت سات آسمانوں کی طرح سات زمینوں کی بھی قائل رہی ہے، ان کے مطابق (مِثۡلَهُنَّ) میں ضمیر جمع مونث غائب کا مرجع (سَبۡعَ) تھا مگر غور کیا جاسکتا ہے کہ اگر بات ایسی ہی ہوتی تو قرآن حکیم براہ راست "خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَ سَبۡعَ أَرَضِیۡنَ" کہہ دیتا اور اسے عبارت میں ظاہری ابہام کی چنداں ضرورت نہ رہتی، درحقیقت زمینوں کے تعدد کے بیان میں کتاب اللہ کی جس احتیاط اور دور اندیشی کا مشاہدہ ہم نے پچھلے صفحات میں کیا ہے معاملہ یہاں بھی ٹھیک وہی ہے، چنانچہ اگر ہم قرآن عظیم میں (السَّمٰوٰتُ) کے دیگر مناسجوں سے استعمال کا بہ غور جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کلام الٰہی ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود سارے اجرام کی تعبیر جس طرح (السَّمٰوٰتُ وَالۡأَرۡضُ وَمَا بَیۡنَهُمَا) (آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے) سے کرتا ہے، اس کو کبھی صرف (السَّمٰوٰتُ) (آسمانوں) سے بھی کردیتا ہے، ان دونوں تعبیروں کی بالترتیب مثالیں اس طرح ہیں:

اَلَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضَ وَمَا

جس نے آسمانوں اور زمینوں اور ان کے

بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ...... (فرقان:۵۹)	درمیان جو کچھ بھی ہے ان کی تخلیق چھ دن میں کی، پھر عرش پر استوا فرمایا۔
اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ...... (اعراف:۵۴)	بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق چھ دن میں کی، پھر عرش پر استوا فرمایا۔

ان دونوں آیتوں میں چھ دنوں کی تخلیق کی تصریح سے ظاہر ہے کہ یہاں ساتوں آسمان اور ان میں موجود ساری زمینوں اور دیگر تمام اجرام کی تخلیق کا تذکرہ ہورہا ہے، چنانچہ اگر ہم ان مظاہر فطرت کی ایک وسیع تر تقسیم کریں تو وہ تین بنیادی اجزا پر مشتمل ہوگی: ۱- ساتوں آسمان، ۲- کل زمینیں اور ۳- دیگر اجرام سماوی، یہاں پہلی آیت میں خود قرآن مجید نے بھی کائنات کی ٹھیک اسی سہ گانہ تقسیم کا لحاظ کرتے ہوئے ان تینوں اجزا کی تعبیر بالترتیب (السَّمٰوٰتُ) (آسمانوں)، (اَلْاَرْضُ) (زمینوں) اور (وَ مَا بَیْنَهُمَا) (ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے) کے ذریعے کی ہے، جب کہ دوسری آیت میں تیسرے جز (وَمَا بَیْنَهُمَا) کو کلی طور پر حذف کرتے ہوئے صرف (السَّمٰوٰتُ) اور (اَلْاَرْضُ) کے ذکر ہی پر اکتفا کیا گیا ہے، جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہاں اس تیسرے جز کو پہلے جز میں مدغم کردیا گیا ہے، لہٰذا اس دوسری تقسیم سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں (السَّمٰوٰتُ) ایک نہایت جامع اور وسیع ترین لفظ ہے جو ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود سارے سورجوں اور دیگر تمام اجرام پر بھی دلالت کرنے والا ہے اور جس کی تاکید کبھی (سَبْعَ) (سات) سے اور کبھی (السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَمَا بَیْنَهُمَا) (آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے) سے کردی جاتی ہے، اسی طرح سورہ لقمان والی آیت کے تحت بھی اس کا استعمال ملحوظ خاطر رہے، جو نظر نہ آنے والے ستونوں کے سہارے پیدا کیے گئے سارے ہی اجرام سماوی بشمول ساری زمینوں کو بھی بہ حسن وخوبی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، چنانچہ اس سے بھی ثابت ہورہا ہے کہ یہ لفظ مفرد طور ہی پر سارے آسمانوں کے کل اجرام پر بھی دلالت کرنے والا ہے، نیز ان دلائل سے آسمانوں کے مفہوم میں ان کے تمام اجرام کا شامل ہونا ایک بدیہی حقیقت ہے، جیسا کہ صرف کسی ملک کا نام لے کر اس سے اس کے کل باشندوں کا مراد لیا جانا

عام طور پر متعارف ومتداول ہے، مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان ایک کثیرالمذاہب ریاست یا انگلستان ایک ترقی یافتہ مملکت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاہب کی کثرت اور ترقی ان کے باشندوں کے اعتبار سے ہے نہ کہ نفس ممالک کے لحاظ سے۔

لہٰذا اب (السَّمٰوٰتُ) کے اس جدید مفہوم کی وجہ سے (اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ) کا مطلب ایک اور مرتبہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح سات آسمان بشمول ان کے تمام اجرام اور خصوصاً سورج پیدا کیے ہیں ٹھیک ان ہی کی طرح زمینیں بھی پیدا کی ہیں، یعنی اوپر اگر ساتوں آسمانوں میں زمینوں کے وجود سے ہر جگہ ان کے مراکز سورجوں کے وجود اور خود سورجوں کے وجود سے ان کی ماتحت زمینوں کے وجود پر دلیل قائم کی گئی تھی تو یہاں صراحتاً ان زمینوں کی تعداد خود سورجوں کے ہم مثل قرار دے کر اس کے ذریعے وہاں رہ رہے ابہام کو بھی دور کیا جارہا ہے، اس طرح یہاں (مِثْلَهُنَّ) میں مثلیت کا تعلق صرف (سَبْعَ) سے نہیں بلکہ (سَبْعَ سَمٰوٰتٍ) دونوں ہی سے ہوجاتا ہے، آیندہ انشاء اللہ اس آیت کریمہ پر مزید روشنی خود اسی سیاق کی آیتوں سے ڈالی جائے گی، جس سے اس قرآنی انکشاف کی معنویت اور ظاہر ہوگی۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا جاچکا ہے، اس وقت یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ جدید فلکیات موجودہ کائنات کے علاوہ متعدد مزید کائناتوں کے ممکنہ وجود پر بھی ٹھوس علمی واستدلالی شواہد اکٹھا کررہی ہے، جس کے نتیجے میں universe کی جگہ multiverse کا نظریہ جڑ پکڑتا جارہا ہے، البتہ ابھی وہ اس نظریے یا نظریات کے خدوخال کو تشفی بخش طور پر واضح نہیں کرسکی ہے، مگر جیسا کہ ہماری اس گفتگو سے مدلل طور پر ثابت ہورہا ہے، قرآن مجید نے ان ممکنہ کائناتوں کو نہایت یقینی صورت حال میں تبدیل کرتے ہوئے نہ صرف ان کی بنیادی ساخت وپرداخت کو واضح کردیا ہے بلکہ نہایت دوٹوک الفاظ میں ان کے معین عدد تک کی بھی تصریح کردی ہے، چنانچہ جدید فلکیات کی رو سے ثابت شدہ ہماری ساری کائنات قرآن حکیم کے مطابق ہمارے موجودہ صرف ایک دنیوی آسمان کے اندر واقع ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بقیہ چھ آسمان چھ دیگر کائناتیں ہیں اور وہاں بھی چاند، ستاروں، سورجوں، زمینوں اور دیگر اجرام کا یہی سلسلہ جاری وساری ہے، آج آسمانوں سے کائناتوں کا مراد لیا جانا اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ فی الحال ہم سب سے قریبی آسمان میں ہیں اور بقیہ

چھ آسمان ہمارے اوپر طبق در طبق واقع ہونے کی وجہ سے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں اور فلکیات کا دعوا بھی ٹھیک یہی ہے کہ ساری کائناتیں موجودہ کائنات کے ماوراء اور ہم سے پوشیدہ ہیں۔

ایک انقلابی اور نہایت دور رس حقیقت یہ بھی ثابت ہو رہی ہے کہ قرآن حکیم میں (اَلْاَرْض) کا استعمال بہ طور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس کی تاکید کبھی کبھار (جَمِیْعًا) سے کی جاتی ہے یا اس کی جانب ضمیر جمع سے اشارہ کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ کتاب اللہ زمینوں کی کثرت کے باوجود اس پر دلالت کے لیے کہیں بھی "سَمٰوٰتٌ" ہی کی طرح بہ صیغۂ جمع "اَرْضُوْنَ" یا "اَرْضِیْنَ" کا استعمال قطعاً نہیں کرتی ہے، اس کی مزید تاکید و تقویت کے لیے کچھ اور قرآنی دلائل بھی ملاحظہ ہوں:

۸- اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ...... (یونس:۳)

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے چھ دن میں سارے آسمان اور زمینیں بنائیں، پھر عرش پر استوا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے پورے چھ دن میں جس تخلیق کے بعد عرش پر استوا فرمایا وہ سارے آسمان اور ان میں موجود سارے اجرام سماوی اور زمینیں ہیں مگر اس موقع پر (الارض) کا لفظ مفرد ہی لایا گیا ہے:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ...... (انبیاء:۳۰)

کیا کفار نے نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا جدا کر دیا۔

اس آیت میں جس مادے کے آپس میں ملے ہوئے رہنے کی خبر دی جا رہی ہے وہ اپنی پیدائش سے قبل بلا استثنا سارے آسمانوں بہ شمول ساری زمینوں اور دیگر اجرام سماوی کا ہے مگر یہاں بھی لفظ (الارض) بہ طور صیغۂ واحد ہی آیا ہے۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا

وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ قیامت کا وقوع کب ہوگا، آپ کہہ دیجیے کہ اس کا علم تو میرے

یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... (اعراف:۱۸۷)

رب ہی کے پاس ہے، وہی اسے اپنے وقت پر ظاہر کرے گا، وہ سارے آسمانوں اور زمین میں بھاری ہوگی۔

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ...... (زمر:۶۸)

صور پھونکا جائے گا تو جو کوئی سارے آسمانوں اور زمین میں ہے بے ہوش ہو جائے گا بہ جز ان کے جنہیں اللہ چاہے۔

قیامت کا عموم سارے آسمانوں اور ان میں موجود جمیع اجرام پر ہوگا مگر ان دونوں آیات میں بھی (الارض) کا استعمال بہ طور صیغۂ واحد ہی کیا گیا ہے:

...... وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ...... (بقرہ:۲۵۵)

اس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے۔

اللہ جل جلالہ کی کرسی سارے آسمانوں اور ان کے مشتملات کو گھیرے ہوئے ہے مگر ان سارے آسمانوں کے لیے (الارض) کا لفظ پھر ایک مرتبہ مفرد طور پر لایا گیا ہے، چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب اللہ میں (الارض) کا استعمال اعجازی انداز میں بہ طور اسم جنس ہی ہوا ہے، یہاں ایک عقلی توجیہ یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ خود لفظ (السماوات) میں آسمانوں کی دیگر زمینیں بھی شامل ہونی چاہئے، کیوں کہ خود ہماری زمین بھی دیگر زمینوں کے لیے "سَمَآءٌ" ہی کے قائم مقام ہوتی ہے، اگرچہ قرآن حکیم میں اس نوع کی بھی وافر مثالیں موجود ہیں، جیسے کہ لقمان والی آیت، مگر یہ تعریف کتاب اللہ کی صرف جزوی صداقت کو ظاہر کرنے والی ہوگی، کیوں کہ وہ آیات جہاں (اَلسَّمٰوٰتُ) کے بغیر صرف (اَلْاَرْضُ) ہی سے زمینوں کا تعدد مراد لیا گیا ہے وہاں یہ توجیہ ناکام ہو جائے گی، اس نوع کی اور آیتیں حسب موقع آیندہ پیش ہوں گی، جس سے حقیقت اور واضح ہوگی، لہٰذا جب تک دیگر قرائن سے پتہ نہ چل سکے کہ (اَلْاَرْضُ) سے ہماری صرف یہی ایک زمین مراد ہے، اسے اسم جنس ہی شمار کیا جائے گا، البتہ جہاں جہاں (السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ) کی ترکیب لائی گئی ہے یا (اَلْاَرْضُ) کو (اَلسَّمٰوٰتُ) کے سیاق و سباق میں استعمال کیا گیا ہے، وہاں ہر جگہ ساتوں آسمان اور ان میں موجود ساری ہی زمینیں مراد

ہوں گی، اسی طرح (اَلسَّمَآءُ وَالْاَرْضُ) سے بھی یہی مفہوم مراد ہوگا، کیوں کہ (اَلسَّمَآءُ)
اسم جنس بھی ہے، کبھی کبھار بہ طور تاکید (اَلسَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَا بَيْنَهُمَا) یا (اَلسَّمَآءُ
وَالْاَرْضُ وَمَا بَيْنَهُمَا) کی ترکیبات بھی لائی جاتی ہیں۔

یہ تھے زمینوں کی بے انتہا کثرت پر حقیقی الفاظ وتعبیرات کے ذریعے بیان کیے گئے کچھ
ربانی ارشادات، اس موضوع سے متعلق دیگر آیات ایسی بھی ہیں جہاں ان کا اثبات مجازی الفاظ
وترکیبات کے ذریعے کرتے ہوئے ان میں بسی مخلوقات کے احوال وکوائف پر بھی گفتگو ممکن ہے
اور ہم اس کی کوشش کریں گے۔

اب تک کی بحث ومطالعہ سے مدلل طور پر ثابت ہورہا ہے کہ قرآن حکیم زمینوں کے بیان
میں ایک منظم اور نہایت دقیق منصوبہ بندی کے تحت قصداً ایسے حکیمانہ الفاظ وتعبیرات کا انتخاب کرتا
ہے کہ اگر متقدمین پر ان کا صحیح عدد پوری طرح واضح نہ ہوسکے اور دوسری جانب ایک معین وقت پر
جب متاخرین خود اپنے علوم وفنون کے ذریعے اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں کسی حد تک
کامیاب ہوجائیں تو اس وقت ان کا مدلول ومفہوم از خود روز روشن کی طرح عیاں ہوکر ان پر اپنا
بے نظیر علمی اعجاز پیش کرسکے، چنانچہ یہ حکمت عملی اس لیے اپنائی گئی ہے، کیوں کہ کتاب الٰہی عقل و
نقل کے درمیان اس بے نظیر ذخیرہ کن تطبیق وہم آہنگی کی روشنی میں انسان کی اور خود اپنی بھی
اصلیت کے تعلق سے کچھ عمیق وفیصلہ کن انکشافات کرکے منکرین پر اتمام حجت کرنا چاہتی تھی،
تاکہ ان کے پاس اس کی تکذیب کا کوئی بھی عذر باقی نہ رہ سکے، انشاء اللہ العزیز ہم ان حقائق کا
مطالعہ پیش کریں گے، اب حسب ذیل آیت کریمہ ملاحظہ ہو جو اسی مقصد کی نشان دہی منصوص طور
پر کرتے ہوئے ہمارے موجودہ طرز فکر کو پروان چڑھانے والی بھی ہے:

۹- سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (حم سجدہ: ۵۳)

ہم عنقریب ان (کفار) کو اپنی نشانیاں (زمین اور آسمانوں کے) اطراف واکناف میں اور خود ان کی جانوں میں بھی دکھادیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے کہ یہی (قرآن) حق ہے، کیا تمہارے رب کے لیے یہ کافی نہیں کہ

وہ ہر چیز پر شاہد ہے؟۔

یہاں درایت وروایت دونوں ہی اعتبارات سے (اَلْاٰفَاق) کے معنے ”زمین اور
آسمانوں کے اطراف واکناف“ کے آتے ہیں:

”ما ظهر من نواحي الفلك وأطراف الارض“ (لسان العرب، تاج العروس)

”ما ظهر من نواحي الفلك“ (القاموس المحیط)

”اقطار السماوات والارض“ (سیوطی، قرطبی عن عطاء وابن زید)

ثابت ہوا کہ یہاں زمین اور آسمانوں کے اطراف واکناف کی وہ خدائی نشانیاں
جنھیں قرآن مجید متقدمین سے مستور الحال رکھ کر متاخرین پر ظاہر کرنے کا منصوص اعلان کررہا
ہے، وہ یہی دیو ہیکل کائنات اور خصوصیت کے ساتھ اس میں موجود ان گنت زمینیں ہیں، یاد
رہے کہ اوپر جہاں ساتوں آسمانوں میں ان گنت زمینوں کے وجود کی خبر اگر سورہ حم سجدہ کی ابتدا
میں تھی تو اس کا تعلق اسی سورہ اختتام سے ہے، جس سے ہمارا استدلال اور قوی ہوجاتا ہے، اس
طرح راقم سطور کی موجودہ کاوش کی تائید ونصرت میں گویا ایک اہم سند بھی مہیا ہوجاتی ہے، پھر
(حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ) (تاکہ ان پر ظاہر ہوجائے کہ یہ قرآن ہی حق
ہے) کے ذریعے اس حکیمانہ اخفا واظہار کی غرض وغایت کا خلاصہ کیا جارہا ہے کہ اولین سے مخفی
رکھے گئے یہ آسمانی حقائق آخرین پر خود ان کے علوم وفنون کے ذریعے اس لیے ظاہر کیے جارہے
ہیں، تاکہ ان پر کتاب الٰہی کا علمی اعجاز ظاہر ہو اور انہیں کامل شرح صدر ہوجائے کہ اس کتاب
برحق کو نازل کرنے والی عین وہی ذات ہے، جس نے ساری کائنات کی تخلیق بھی فرمائی ہے، پھر
(اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ) (کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں
کہ تمہارا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟) کے ذریعے اس مفہوم کو مزید موکد کرتے ہوئے انسان سے بہ طور
حجت سوال کیا جارہا ہے کہ خود اس کے تجربات ومشاہدات پر مبنی اکتسابی علم اور من جانب اللہ
نازل کردہ علم وہبی میں اس قدر تطبیق وہم آہنگی کے اثبات واظہار کے باوجود کیا اس کے دل و
دماغ میں اب کوئی شک اپنے رب کے جمیع مظاہر کائنات پر محیط کلی وقطعی علم کے تعلق سے باقی
بھی ہے؟ اور کیا اس کی یہ بے نظیر ہمہ دانی وہمہ علمی اس کی خلاقیت وربوبیت اور اس کے نتیجے میں

اس کی الوہیت و معبودیت کا اثبات کرنے والی نہیں ہے؟ اسی لیے کتاب اللہ ایک اور جگہ ان نشانیوں کو مستقبل میں ظاہر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے یہ دعوا بھی پیش کررہی ہے کہ وہ اس قدر واضح یعنی علم انسانی سے اس قدر میل کھانے والی ہوں گی کہ خود کفار و منکرین تک انہیں ضرور پہچان لیں گے:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (نمل: ۹۳)

آپ کہہ دیجیے کہ ساری تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو عنقریب تم (گم راہ لوگوں) کو اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان بھی لوگے اور تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے تمہارا رب غافل بھی نہیں ہے۔

غور کیا جاسکتا ہے کہ اس شمارے کی ان دونوں آیات کے ذریعے کتاب اللہ عقل انسانی اور علوم طبیعی کو کس قدر قابل حجت اور قابل استدلال قرار دے رہی ہے کہ ان کے ذریعے انسان رب العالمین کے دلائل ربوبیت کی معرفت حاصل کرسکتا ہے اور انہیں میزان عدل بنا کر خود صحیفۂ ربانی کی صداقت و حقانیت تک پہنچ سکتا ہے! باری تعالیٰ والد ماجد حضرت علامہ محمد شہاب الدین ندوی قدس سرہ العزیز کے درجات قرب میں اضافہ اور ان کی تربت پر اپنے رحم و الطاف کا خصوصی نزول فرمائے کہ وہ نصف صدی قبل ہی اس حقیقت عظمی کی کلی معرفت حاصل کرنے میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے اور ایک سو سے بھی زائد تصنیفات کے ذریعے اس میدان میں ایک بے نظیر اور جلیل القدر تجدیدی کارنامہ انجام دیا، یہ ان کے ایمان و یقین، علم و عرفان اور اخلاص و للّٰہیت اور احیائے دین متین کی تڑپ کا نتیجہ ہے کہ یہ تحریریں منظر عام پر آسکی ہیں، فجزاہ اللہ عنی و عن الاسلام والمسلمین و رحمہ رحمۃ واسعۃ و غفرلہ واسبغ علیہ نعمہ و ادخلہ فی فسیح جناتہ!

آخر میں اس بحث پر ایک دوسرے زاویے سے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ ان خدائی نشانیوں کے مستقبل میں ظاہر کیے جانے کا اعلان رسول اکرمؐ کے ذریعے کفار و منکرین کو مخاطب فرما کر کیا جارہا ہے اور یہ پیش گوئی کی جارہی ہے کہ وہ انہیں یقینی طور پر پہچان بھی لیں گے اور ان پر حق واضح ہوکر رہے گا، اب ظاہر ہے کہ کتاب الٰہی کی صحت و صداقت اور اس کی

حقانیت کا علم خود ان ہی کے علوم و فنون کی روشنی میں حاصل ہوسکے گا، اگر یہ علوم و فنون آج مومنین و مسلمین کے ہاتھوں میں ہوتے تو ان میں وہ تاثیر نہ ہوتی، چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کتاب الٰہی کے عظیم علمی اعجاز کے ظہور کے وقت علوم طبیعی کا منکرین و معاندین کے ہاتھوں میں ہونا بھی غالباً خدائی حکمت و مصلحت اور اس کی گہری منصوبہ بندی میں شامل ہے، تاکہ (فَتَعْرِفُوْنَهَا) کا مصداق ہوکر ان کے پاس اس کی مزید تکذیب کی کوئی بھی گنجائش باقی نہ رہ سکے، کیا عصر حاضر میں کتاب الٰہی کا اس سے بڑا کوئی اور بھی معجزہ ہوسکتا ہے اور کیا منکرین پر اور خصوصیت کے ساتھ معقولیت پسند مادہ پرستوں پر اتمام حجت کا کوئی اور بھی کارگر طریقہ ہوسکتا ہے لہذا شان کریمی سے کچھ بھی بعید نہیں کہ (فَتَعْرِفُوْنَهَا) کے مطابق کتاب الٰہی کا موجودہ علمی اعجاز ان کے دل و دماغ پر اثر کر جائے اور ان کا ایک بڑا اور شریف الطبع و کریم النفس طبقہ رب العالمین کی ربوبیت کی گواہی دے جائے اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردے۔ (وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ)

یہاں اس حقیقت کا اظہار کردینا بھی غیر مناسب نہیں ہوگا کہ دور حاضر میں کچھ آیات و قرآنی بیانات کے مفہوم و مدلول میں وسعت یا تبدیلی پیدا ہوجانے سے سلف صالحین و ائمۂ مفسرین کے فہم قرآن پر ذرا بھی آنچ نہیں آسکتی ہے، کیوں کہ قرآن حکیم نے جدید حقائق کے بیان میں جس حکمت و مصلحت، احتیاط اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے بھی اور خود ان خدائی نشانیوں کے مستقبل میں ظاہر کیے جانے کی مذکورہ بالا تصریحات سے بھی یہ خوبی ظاہر ہوتا ہے کہ من جانب اللہ وہ اسی فہم کے مکلف تھے، انہوں نے اپنے اپنے ادوار میں ان کے جو بھی معانی و مفاہیم مراد لیے وہ خوب تھے، نیز کلام اللہ کے زندہ و تابندہ اور ابدی و سرمدی ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ ہر دور میں فعال و متحرک رہے اور نوع انسانی کو علوم و فنون میں ترقی کی بہ دولت اس سے تازہ بہ تازہ ہدایات ربانی حاصل ہوتی رہیں، تاکہ وہ علم و عقل، افکار و نظریات اور دلیل و استدلال کے کسی بھی زمرے میں اپنے آپ کو کم زور اور بے سروسامان محسوس نہ کریں، لہذا جب کبھی مستند و متداول تفسیری اصولوں کے تحت الفاظ قرآنی کے کوئی نئے معانی و معارف ظاہر ہوں تو انہیں بھی من جانب اللہ ہی تسلیم کیا جائے، اس وقت خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ ان اصول تفسیر و قواعد فہم قرآن کو بھی، جن پر اس وقت ہمارا اعتماد و استناد ہے، خود متقدمین

نے وضع و مرتب کیے ہیں، اپنی جامعیت کے لحاظ سے یہ اصول ہر زمانے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں، البتہ جہاں تک خود فہم قرآن کا تعلق ہے اس میں اختلاف نہ صرف ممکن بلکہ متعدد حیثیتوں سے ممدوح و مستحسن بھی ہے اور اس پر تاریخ تفسیر کی پوری چودہ صدیاں شاہد عدل بھی ہیں، احقر راقم سطور کو یہاں اس امر پر کامل شرح صدر حاصل ہے کہ عہد رسالت میں قرآن عزیز کے نزول کی جو تکمیل ہوئی تھی، قیامت تک اس کے معانی و مفاہیم، ہر دور کے ذہن اور علمی سطح پر ابھرتے اور روشن ہوتے رہیں گے، چنانچہ حسب ذیل آیات میں ٹھیک اسی حقیقت کا اظہار نہایت واضح الفاظ میں اور منصوص طور پر کیا جارہا ہے:

۱۰- لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قیامہ:۱۶-۱۹)

آپ اس (قرآن) کو جلدی جلدی لینے کی خاطر اس پر اپنی زبان مت ہلایا کیجیے، یقیناً اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا ہمارے ہی ذمہ ہے، لہذا جب ہم پڑھنے لگیں تو آپ اس کے تابع ہوجایا کیجیے، پھر (جب ہم چاہیں) اس کی تشریح بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

یہاں (ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ) (پھر قرآن کی تشریح بھی ہمارے ہی ذمہ ہے) سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی تبیین و تشریح کا ذمہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے، چنانچہ یہ ربانی پیش گوئی خصوصیت کے ساتھ (سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا) (عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھادیں گے)، (سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ) (عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھادے گا) وغیرہ دیگر پیش گوئیوں پر بھی ہر طرح سے منطبق ہونے والی اور ان کی عملی شکل کو بھی ظاہر کرنے والی ہے، ظاہر بات ہے کہ آگے چل کر جب بھی منکرین و معاندین پر خود انہیں کے علوم و فنون کی روشنی میں اور ان کی عقل و فہم کے مطابق ان نشانات ربوبیت و معجزات الٰہی کا ظہور ہوگا تو اس صحیفہ ربانی کی معجزنمائی کا ایک اور نیا باب کہلائے گا، چنانچہ حدیث نبویؐ ”دوروا مع کتاب اللہ حیث ما دار“ (اللہ کی کتاب جدہر بھی گھومے تم اس کے ساتھ ادہر گھوم جاؤ) سے اشارہ بھی اسی جانب ہے کہ قرآن مجید ہمارا محور ہے اور یہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے، اس کی ہمہ گیری اس پر ایمان رکھنے

والوں کو بے سمت اور گم راہ نہ ہونے دے گی، نیز ارشادات رسولؐ ”القرآن ذو وجوہ“ (قرآن مختلف چہروں والا ہے)، ”لا یشبع منہ العلماء“ (علما اس سے کبھی شکم سیر نہیں ہوسکیں گے) اور ”لا تنقضی عجائبہ“ (قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے) کا خاصہ بھی تو یہی ہے۔

اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ علم کی ترقی کی بہ دولت آج کے انسان کی معلومات ممکن ہے زیادہ ہوں مگر علمائے سلف اور ائمۂ فن کا فہم اور ان کی علمی و دینی بصیرت کے تفوق کا انکار نہیں کیا جاسکتا، انہوں نے کتاب اللہ کی خدمت امانت و دیانت کے جذبے سے کی اور لفظی و ترکیبی اور فکری و نظریاتی مشکلات میں احتیاط کا اس قدر اہتمام و التزام فرمایا کہ پوری تاریخ انسانیت اس کی کوئی ادنی سی مثال بھی پیش کرنے سے قاصر رہی ہے، آج ہم اپنی علمی عمارت جن بنیادوں پر تعمیر کررہے ہیں وہ ان ہی صالحین کی فراہم کردہ ہیں، یہاں اس عاجز کو اس بات کا پورا اعتراف و یقین ہے کہ وہ ان کا ایک ادنی سا خلف ہی ہے، (ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ)۔

مزید برآں ”القرآن ذو وجوہ“ کے تحت یہ توجیہ بھی قرین عقل اور عین ممکن ہے کہ اسلاف نے قرآن حکیم کا ایک چہرہ دیکھا ہو، جب کہ ہمارے آگے اس کی ایک دوسری ہی علم کشا اور تابناک وخیرہ کن شکل نمودار ہورہی ہو، یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ قرآن حکیم کی بے شمار آیات ایسی بھی ہیں جن کے حقیقی منشا و مراد کے تعلق سے شروع دور ہی سے رایوں کا تعدد نظر آتا ہے اور مفسرین و محققین کے درمیان ان کے صرف ایک معنے پر اتحاد و اتفاق نہیں ملتا، بلکہ اکثر مختلف النوع مجازی تاویلات پر مبنی ہیں اور تفسیر بالرائے کی تعبیر کی حامل ہیں، ہماری پوری کوشش انشاء اللہ آگے کی تحریروں میں بھی رہے گی کہ تفسیر کے سب سے پہلے اور بنیادی اصول ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ کے مطابق کلام اللہ کے عظیم ترین علمی اعجاز کی جلوہ گری کی جائے۔

علم مصطلح حدیث، تاریخ و تعارف

جناب سید عبدالماجد غوری

حدیث کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور حدیث کے معنی: ''حدیث'' کے معنی ''جدید'' کے ہیں، حدیث کے مقابلے میں جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ ''قدیم'' ہے، ''حدیث'' کو حدیث غالباً اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن قدیم ہے اور حدیث قرآن کے مقابلے میں جدید ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ''فتح الباری شرح البخاری'' میں لکھتے ہیں: ''المراد بالحدیث فی عُرف الشرع ما یُضاف الی النبی ﷺ وکأنه أرید به مقابلة القرآن لأنه قدیم ''(۱) شریعت کے عرف میں حدیث اس کو کہتے ہیں جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جائے، گویا کہ اسے قرآن کے مقابلے میں حدیث کہا گیا ہے کیوں کہ قرآن قدیم ہے۔

حدیث کی اصطلاح قرآن کریم سے ماخوذ ہے، چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں: ''إن اطلاق الحدیث علی ما یُضاف الی النبی مقتبس من قوله تعالی : وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (سورۃ الضحیٰ:۱۱)(۲) جو بات نبی ﷺ سے منسوب کر کے کہی جائے اس پر حدیث کا اطلاق کرنا آیت: وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ سے مستعار ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے کلام کو حدیث سے تعبیر فرمایا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اس خوش نصیب انسان کے بارے میں دریافت کیا جسے قیامت کے دن آپ ﷺ کی شفاعت نصیب ہوگی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''لقد ظننت یا أبا هریرة أن لا یسئلنی عن هذا الحدیث أحد أول منک لما رأیت من حرصک علی الحدیث ''(۳) (اے ابوہریرہ! جب میں نے حدیث کے معاملے

ریسرچ اسکالر، مرکز بحوث و تحقیق، دار ابن کثیر، دمشق۔

میں تمہاری حرص دیکھی تو مجھے خیال ہوا کہ تم سے پہلے اس حدیث کے بارے میں کوئی مجھ سے سوال نہیں کرے گا)۔

حدیث کی تعریف: محدثین کے نزدیک ''حدیث'' رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر کا نام ہے، چنانچہ ایوب بن موسیٰ ابوالبقا نے لکھا ہے: الحدیث اسم من التحدیث وهو الاخبار ثم سمی به قول أو فعل أو تقریر نُسب الی النبی ﷺ (۴) حدیث تحدیث کا اسم ہے، پھر اس سے نبی اکرم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر کو موسوم کیا گیا۔

''قول'' سے مراد رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے، مثلاً آپ نے فرمایا: إنما الأعمال بالنیات وإنما لکل امرء ما نوی (۵) عمل کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر انسان کو نیت ہی کے مطابق اجر ملے گا۔

''فعل'' سے مراد آپ ﷺ کی وہ عملی تعلیم ہے جو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو دی، آپ کی زندگی کے معمولات، عبادت کے طریقے، معاشرتی اور سماجی تعلقات، اخلاق و کردار اور رویے سب فعل میں داخل ہیں۔

''تقریر'' سے مراد ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے کسی شخص نے کوئی کام کیا یا آپ کو اس کی اطلاع دی گئی اور آپ نے اس پر اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ خاموش رہے، اس وقت آپ کی خاموشی رضامندی ہی سمجھی جائے گی، کیوں کہ رسول خدا سے یہ متصور نہیں کہ آپ کسی منکر کو دیکھیں اور اس کی اصلاح نہ کریں بلکہ خاموش رہیں کیوں کہ نبی کا معاملہ عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے، وہ کسی بھی نامناسب امر پر ضرور تنبیہ کرتا ہے۔

بعض محدثین نے ''حدیث'' کے معنی میں وسعت پیدا کی ہے اور حدیث کی تعریف اس طرح کی ہے: ''ما أُثر عن النبی ﷺ من قول أوفعل أوتقریر أوصفة خلقیة أوخلقیة أوسیرة سواء کان قبل البعثة أو بعدها ''(۶) جو کچھ نبی ﷺ سے منقول ہو وہ حدیث ہے، خواہ قول و فعل یا تقریر ہو یا جبلی یا اخلاقی صفات ہوں یا قبل از نبوت یا مابعد کی سیرت مبارکہ ہو۔

بعض دیگر علما نے ''حدیث'' کے مفہوم کو مزید وسیع کیا اور حدیث کی تعریف اس طرح کی کہ گویا وہ عہد نبی ﷺ کی ایک تاریخ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریر و کوائف

بھی شامل ہیں اور اس دور کے وہ حالات بھی جن میں آپ ﷺ کی دینی اور دعوتی سرگرمیاں انجام پائیں۔(۷)

امام بخاریؒ نے بھی اپنے مجموعہ حدیث کا نام کچھ ایسا رکھا ہے جس سے اسی وسعت کا اشارہ ملتا ہے: ''الجامع المسند الصحیح المختصر من أمور رسول اللہ ﷺ وسننه وأیامه''

مگر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ''حدیث رسول'' کی حیثیت محض ایک عہد زریں کی معتبر تاریخ کی نہیں ہے بلکہ شریعت اور قانون کی بھی ہے، جو انسانی زندگی کے لیے آئین اور دستور کی حیثیت رکھتی ہے، غالباً اسی بنا پر علمائے سیر اور مغازی کے طریقہ تحقیق سے محدثین کا اصول تحقیق منفرد اور ممتاز ہے۔

حدیث کی غرض وغایت: حدیث کی غرض وغایت ''الاهتداء بهدی النبی ﷺ'' نبی کریم ﷺ کے طریقے کا اپنانا ہے اور اخروی غرض وغایت تمام علوم دینیہ کی ایک ہی ہے، یعنی ''الفوز بسعادة الدارین'' یعنی دونوں جہانوں میں کامیابی۔

حدیث کی فضیلت وشرف: جہاں تک حدیث کی فضیلت وشرف کا تعلق ہے وہ کسی طویل بیان کی محتاج نہیں ہے، قرآن وحدیث کے بے شمار نصوص اس علم کی فضیلت کو ثابت کرتے ہیں، یہاں ان کا استیعاب نہ مقصود ہے اور نہ ممکن ہے، ضرورت ہو تو حافظ ابن عبدالبر اندلسی کی کتاب ''جامع بیان العلم وفضلہ'' کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے، نیز اس علم کی فضیلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی بہ دولت بہ کثرت درود شریف پڑھنے کا موقع ملتا ہے جس کے فضائل بے شمار ہیں۔(۸)

علم مصطلح حدیث، تعارف واہمیت: ائمہ حدیث نے جب تدوین حدیث شروع کی تو سب سے پہلے انہوں نے یہ کیا کہ جتنی اور جیسی کچھ احادیث ان تک جس واسطہ سے پہنچی ہیں سب کو ان واسطوں کے ساتھ جمع کرلیا اور سوائے ان روایات کے جن کے موضوع اور جعلی ہونے کا ان کو پوری طرح علم تھا، کوئی روایت انہوں نے نہیں چھوڑی، پھر انہوں نے راویوں کے احوال کی پوری طرح چھان بین کی، یہاں تک کہ اس تحقیق وتنقیح کے بعد ان کو یہ معرفت حاصل ہوگئی کہ کس کی روایت قبول کی جانی چاہیے اور کس کی رد کردیے جانے کے لائق ہے اور کس کی روایت قبول

کرنے میں توقف کرنا مناسب ہے، اس کے بعد انہوں نے روایت شدہ حدیث کے مضمون اور نفس روایت کی نوعیت میں غور وفکر کیا، کیوں کہ ہر وہ شخص جو عدالت وضبط سے متصف ہو، ضروری نہیں کہ اس کی روایت لازماً قبول کرلی جائے، اس لیے کہ وہ بہرحال انسان ہے اور انسان کو کبھی سہو ونسیان اور وہم بھی ہوجاتا ہے اور روایت کے نفس مضمون کو پرکھنے کے لیے وہ کئی اصول وضوابط سے کام لیتے ہیں جو اصول حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، اس طرح ان کا مقصود حاصل ہوگیا کہ حتی الوسع، امکانی حد تک ہر اس حدیث کے درجہ کی معرفت انہیں حاصل ہوجائے جو ان تک پہنچی ہے اور رواۃ وروایت اور مروی کے احوال وکوائف میں غور وخوض اور بحث ونظر کے سبب انہیں یہ ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ وہ ایسے اصطلاحی اسما وضع کریں جو کہ بحث ونظر کے دوران سہولت کی خاطر استعمال کرسکیں اور جو ان کے درمیان متداول بھی ہوں، جیسا کہ دوسرے فنون میں بحث وکلام کے لیے اصطلاحات مقرر ہیں، پھر ان کے بعد والوں نے ان کی مقرر کردہ اصطلاحات کی بنیاد پر ایک مستقل علم کی عمارت کھڑی کی، جس کا نام انہوں نے ''مصطلح حدیث'' رکھا جو ایک ایسا علم ہے جس سے حدیث کے کسی طالب علم کو مفر نہیں، کیوں کہ یہ فن علم حدیث کا دروازہ ہے اور بعض لوگوں نے اس کا نام ''علم درایۃ الحدیث'' رکھا ہے اور اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ ایسے قوانین کے جاننے کا نام ہے جن سے یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ روایت صحیح ہے یا حسن یا ضعیف، مرفوع ہے یا موقوف یا مقطوع، سند عالی ہے یا نازل اور تحمل وادا کی کیا کیفیت ہے اور یہ کہ رجال سند کی صفات کیا ہیں اور اسی قسم کی دوسری معلومات۔(۹)

اصول حدیث کے مباحث: علامہ ابن اثیرؒ ''جامع الاصول'' میں لکھتے ہیں:

''علوم شریعت کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا حاصل کرنا فرض ہے اور دوسری وہ جس کا حاصل کرنا نفل ہے، پھر فرض کی دو قسمیں ہیں، فرض عین اور فرض کفایہ اور فرض کفایہ کے سلسلے میں اولیت رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور آثار صحابہ کو حاصل ہے، جن کا ادلۂ احکام میں دوسرا درجہ ہے (یعنی اسلامی قانون کا وہ دوسرا ماخذ ہے) اور اس کے کچھ اصول ہیں، کچھ احکام وقواعد ہیں اور چند اصطلاحات ہیں جن کو علما نے بیان کیا ہے اور محدثین وفقہا نے ان کی تشریحات کی ہیں جن کی معرفت اور جن سے واقفیت حاصل کرنا حدیث کے طلبا کے لیے لازمی ہے، البتہ ان سے

پہلے حدیث کے طالب علم کے لیے لغت اور قواعد کا علم حاصل کرنا ضروری ہے جو حدیث وغیرہ کی معرفت کے لیے اساسی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں کہ شریعت مطہرہ عرب کی زبان میں نازل ہوئی ہے، پھر لغت وقواعد کے بعد ان چیزوں کا جاننا جو اس علم (علم مصطلح الحدیث یا اصول حدیث) کے دامن میں پھیلی ہوئی ہیں، مثلاً:

۱-لوگوں کے اسما، ان کے نسب، ان کی عمریں اور ان کی تاریخ وفات۔ ۲-راویوں کی صفات وشرائط، جن کی بنا پر ان کی روایتیں قبول کی جاتی ہیں۔ ۳-راویوں کے اخذ حدیث کی کیفیت۔ ۴-طرق حدیث وسند کی تقسیمات۔ ۵-اگر روایت باللفظ ہے تو کیا راوی نے ٹھیک ٹھیک اس کو اسی طرح ادا کیا ہے یا نہیں، جیسا کہ اس نے سنا تھا۔ ۶-اتصال سند اور اس کے مراتب۔ ۷-روایت بالمعنی جائز ہے یا نہیں، جائز ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ۔ ۸-روایت مکمل ہے یا نامکمل، اصل حدیث میں اگر کوئی اضافہ ہے تو راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ۔ ۹-مسند اور اس کے شرائط۔ ۱۰-سند عالی وسند نازل۔ ۱۱-مرسل، منقطع، موقوف اور معضل وغیرہ اور ان کے قبول ورد کرنے کے باب میں لوگوں کے اختلاف۔ ۱۲-جرح و تعدیل اور ان کے جواز ووقوع کے دلائل اور مجروحین کے طبقات۔ ۱۳-صحیح وغیر صحیح اور غریب وحسن وغیرہ۔ ۱۴-اخبار متواترہ، اخبار آحاد، ناسخ ومنسوخ۔

یہ اور اس قبیل کی بہت سے دوسری معلومات ہیں جو اس فن کی بہ دولت حاصل ہوتی ہیں، لہٰذا جو ان کو ذہن نشین کرے اور ان میں عبور حاصل کرے، وہی اس علم حدیث کے گھر میں اس کے دروازے سے داخل ہو سکتا ہے اور جس میں جتنا نقص رہے گا اور اس فن کے مباحث و مسائل کی جس شاخ سے جتنا ناواقف رہے گا، اسی مناسبت سے اس کا درجہ کم ہوگا اور اس کا رتبہ گھٹے گا۔ (۱۰)

یہی وجہ ہے کہ حافظ عراقیؒ اپنی ''شرح الفیہ'' کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

''علم حدیث ایک بلند پایہ علم ہے اور اس کے فوائد بے پایاں ہیں، اکثر احکام کا اس پر دار ومدار ہے اور اسی سے حلال وحرام کی معرفت حاصل ہوتی ہے لیکن حدیث کا وہی طالب علم اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو ائمۂ حدیث کی مقرر کردہ اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ کر ذہن نشیں

کر لے''۔ (۱۱)

اس علم کا مقام اور اس کی اہمیت: حاصل کلام یہ ہے کہ ''علم مصطلح الحدیث'' آثار و اخبار میں وارد شدہ باتوں کے لیے میزان کی حیثیت رکھتا ہے، اسی سے صحیح وسقیم، ضعیف وقوی اور مقبول ومردود کا علم ہوتا ہے اور ان ہی پر یہ حکم مرتب ہوتا ہے کہ مقبول روایت اختیار کی جائے (جس پر عمل لازمی ہے) اور مردود روایت ترک کر دی جائے، نیز اس سے حلال وحرام کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور فرض ومسنون کا فرق معلوم ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ میزان نہ ہوتی تو صحیح وسقیم اور حق و باطل کے درمیان تمیز انتہائی دشوار ہوتی اور ہم گم راہی کے جنگل میں حیران اور جہالت کے بیابانوں میں سرگرداں رہتے لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی شریعت اور اپنے نبی ﷺ کی سنت کی حفاظت منظور تھی، جیسا کہ اس نے اپنی کتاب مبین کی حفاظت کی، چنانچہ اس نے ایسے افراد پیدا کیے، جنہوں نے اس (شریعت) کے راستوں کو منور کیا اور اس کے طریقے کو واضح اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔

اس علم کی اہمیت اور اپنے قول کی وضاحت کے بیان کے لیے یہاں اس کے مسائل میں سے بہ طور نمونہ ایک چیز پیش کی جاتی ہے۔

امام نوویؒ ''تقریب'' اور امام سیوطیؒ اس کی شرح ''تدریب الراوی'' (۱۲) میں سلسلہ اسناد میں جس قسم کی باتوں کا جاننا ضروری ہے، ان میں سے ساٹھویں قسم یہ بتاتے ہیں کہ:

''راویوں کی تاریخ پیدائش کا علم اور ان کے سماع روایت کا ثبوت اور یہ کہ وہ فلاں شہر میں آئے تھے یا نہیں اور ان کی وفات کس سنہ میں ہوئی''، پھر سیوطیؒ لکھتے ہیں:

''یہ ایک بڑا اہم علم ہے، جس سے حدیث کا متصل اور اس کا منقطع ہونا معلوم ہوتا ہے، بالخصوص جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ہیں جنہوں نے بعض لوگوں سے روایت کی ہے لیکن اس علم کی اس شاخ (ساٹھویں قسم) نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا اور ظاہر ہوا کہ انہوں نے ان سے روایت کا دعوا ان کی وفات کے کئی سال بعد کیا، مثلاً اسماعیل بن عیاش نے ایک شخص سے امتحاناً سوال کیا کہ کس سنہ میں تم نے خالد بن معدان سے سن کر روایت لکھی ہے؟ تو اس نے جواب دیا ۱۱۳ھ میں، تو اسماعیل بن عیاش نے کہا کہ خوب! مطلب یہ ہوا کہ تم نے ان کی وفات کے سات سال بعد ان سے سنا ہے؟ کیوں کہ ان کا انتقال ۱۰۶ھ میں ہو گیا تھا (اور بعض ۱۰۵ھ کہتے ہیں

اور بعض ۱۰۴ھ اور بعض ۱۰۳ھ اور بعض نے ۱۰۸ھ کہا ہے)''۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یہ ہے کہ حاکم نیساپوریؒ نے محمد بن حاتم کشی سے ان کی ولادت کے بارے میں پوچھا، جب کہ انہوں نے عبد (الحمید) بن حمید سے ایک روایت بیان کی، تو انہوں نے اپنی ولادت کا سال ۲۶۰ھ بتایا، اس پر حاکم نے کہا کہ انہیں دیکھیے، انہوں نے عبد ابن حمید سے ان کی وفات کے تیرہ سال بعد سنا ہے!

یہی وجہ ہے کہ قاضی حفص بن غیاث کہا کرتے تھے کہ جب تمہیں کسی راوی کے بابت شبہ ہو تو سن اور سال کے ذریعہ حساب کرو، یعنی اس کی عمر اور جس راوی کے واسطہ سے اس نے روایت کی اس راوی کی عمر کو سامنے رکھو۔

سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''جب راویوں نے دروغ گوئی سے کام لینا شروع کیا تو ہم نے ان کے لیے تاریخ کا استعمال شروع کیا اور حسان بن یزید کہا کرتے تھے کہ ہم نے جھوٹوں کی گرفت کے لیے تاریخ جیسی مددگار چیز پائی کہ ہم راوی سے پوچھتے ہیں کہ تم کب پیدا ہوئے، پھر جب وہ اپنی پیدائش کا سنہ ٹھیک ٹھیک بتا دیتا ہے تو ہم اس کے سچ جھوٹ کا اندازہ کر لیتے ہیں''۔

ابوعبداللہ الحمیدی کا قول ہے کہ ''علوم الحدیث میں سب سے مقدم تین امور میں مشق و مہارت نہایت ہی اہم ہے، علل اور موتلف ومختلف اور شیوخ کی تاریخ وفات''۔ (۱۳)

آپ نے دیکھا کہ راویتوں کے نقادوں اور ان کی تنقیحات میں لگے رہنے والے محدثین عظام نے راوی کے صدق وکذب کا حال کس طرح ولادت ووفات کی تاریخوں کے ذریعے معلوم کیا، اس علم کی یہی اہمیت وضرورت اور افادیت ہے جس کی بنا پر ائمہ حدیث نے اس کی جانب خاص توجہ مبذول کی ہے اور اس فن کی روایتوں کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے لیے ایک عمدہ کسوٹی بنا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

علم حدیث کی قسمیں: علامہ ابن الاکفانیؒ نے ''ارشاد المقاصد'' میں لکھا ہے کہ علم حدیث کی ابتداً دو قسمیں ہیں: علم روایۃ الحدیث وعلم درایۃ الحدیث، مندرجہ ذیل سطور میں اس کی مختصر تعریف یوں ہے:

۱-علم روایۃ الحدیث: علم روایۃ الحدیث کی تعریف یہ ہے کہ: ''ھو علم ینقل أقوال النبی ﷺ وأفعاله وأحواله بالسماع المتصل وضبطها وتحریرها'' یہ ایسا علم ہے جو نبی اکرم ﷺ کے افعال واحوال کو راست سماعت اور اس کو ضبط وتحریر کے ساتھ نقل کرتا ہے۔

۲-علم درایۃ الحدیث: اور علم درایۃ الحدیث کی تعریف یہ ہے کہ: ''ھو علم یتعرف به أنواع الروایة وأحکامها وشروط الرواۃ وأصناف المرویات واستخراج معانیها'' یہ ایسا علم ہے جس سے روایت کی انواع اور اس کے احکام، رواۃ کے شرائط، مرویات کے اقسام اور اس کے معانی کے استخراج کا علم ہوتا ہے۔

لہذا کسی حدیث کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ وہ فلاں سند سے فلاں الفاظ کے ساتھ مروی ہے، یہ ''علم روایۃ الحدیث'' ہے اور اس کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ خبر واحد ہے یا مشہور، صحیح ہے یا ضعیف، متصل ہے کہ منقطع، اس کے رجال ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، نیز اس حدیث سے کیا کیا احکام مستنبط ہوتے ہیں اور کوئی تعارض تو نہیں ہے، اگر ہے تو کیوں کر رفع کیا جا سکتا ہے، یہ سب باتیں ''علم درایۃ الحدیث'' سے متعلق ہیں۔

علم مصطلح حدیث کی نشو ونما اور اس کی تدریجی ترقی: ''علم مصطلح حدیث'' کا آغاز عہد صحابہ میں روایت حدیث کی نشو ونما کے ساتھ ہوا، صحابہ کرامؓ نے رسول اکرم ﷺ کی احادیث کی نقل وروایت کے وقت ان اصول وقواعد کو ملحوظ رکھا اور انہوں نے منہج قرآن پر مبنی اس کے حسب ذیل اصول مرتب کیے، جیسے جھوٹ کو حرام قرار دینا، فاسق کی خبر کو رد کر دینا، راوی کی روایت کو قبول کرنے کے لیے عدالت کی شرط، جھوٹی خبر کو نقل کرنے کی حرمت اور ہر مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنا۔

حدیث کو روایت کرنے میں صحابہ کرام نے نہایت احتیاط سے کام لیا، اس کی صحت کی چھان بین کی، اس کے قواعد ونصوص پر روایتوں کو پرکھا۔

صحابہ کرام اور ان کے بعد کبار تابعین اخذ حدیث اور ادائے حدیث کے وقت ان قواعد پر عمل کرتے رہے، اگرچہ یہ قواعد اس وقت تک مدون نہیں ہوئے تھے، ان کو پہلی مرتبہ امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) نے اپنی کتاب ''الرسالۃ'' میں ذکر کیا اور اس میں درج ذیل امور کو ملحوظ رکھا، جیسے مرد وعورت دونوں کی حدیث قبول کی جائے گی، جن کی روایت قبول کی جائے گی ان کے اوصاف

بھی بیان کیے جائیں گے، غیر مدلس کی روایت عنعنہ کو قبول کیا جائے گا، اگر مدلس، تحدیث کے صیغے کے ساتھ روایت کرے تو اس کی یہ روایت قابل قبول ہوگی، جو راوی روایت حدیث میں کثرت سے غلطی کرتا ہو اس کی خبر رد کردی جائے گی اور راوی کی عدالت کا جاننا ضروری ہوگا وغیرہ۔ (۱۴)

اس فن کے بعض قواعد کتب حدیث میں بھی پائے گئے ہیں، مثال کے طور پر "صحیح البخاری" میں بعض ابواب کے تراجم اس طرح ہیں:

باب قول المحدث: حدثنا و أخبرنا، باب ما يذكر في المناولة، باب متى يصح سماع الصغير، باب الخروج في طلب العلم، الحرص على الحديث اور باب كتابة العلم وغیرہ۔

امام بخاریؒ (متوفی ۲۵۶ھ) نے اپنی "صحیح" میں متعدد جگہوں پر اس فن سے متعلق بعض اصول کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے، جیسے زیادت ثقہ، متابعات اور کئی جگہوں پر غریب الفاظ کی بھی تشریح کی ہے اور کہیں پر اختلاف روایات کے ذکر کا بھی اہتمام کیا ہے وغیرہ۔

امام مسلمؒ (متوفی ۲۶۱ھ) نے بھی اپنی "صحیح" کے قیمتی مقدمے میں چند اصول بیان کیے ہیں، مثلاً حاملین حدیث کی طبقات میں تقسیم، "منکر" حدیث کو جاننے کا طریقہ، زیادت ثقہ، روایت کے آداب، دین میں سند کا مقام وحیثیت، جرح، غیبت کی تعریف میں نہیں آتی اور حدیث معنعن اور اس سے صحت استدلال وغیرہ۔

اسی طرح "جامع الترمذی" میں بھی اس قسم کے بعض اصول موجود ہیں اور اس کے علاوہ امام ترمذیؒ (متوفی ۲۷۹ھ) نے "العلل الصغیر" (جو در اصل جامع الترمذی ہی کا مقدمہ ہے) میں بھی جرح وتعدیل، سند کی اہمیت، ضعیف راویوں سے روایت کب قابل حجت ہوگی اور کب نہیں، روایت بالمعنی، بعض کبار محدثین کے مراتب، اخذ حدیث و ادائے حدیث کی شکلیں، حدیث مرسل کا حکم اور اپنی کتاب میں موجود خاص اصطلاح "حدیث حسن غریب" سے مراد وغیرہ جیسے اہم مباحث کا ذکر کیا ہے، اس رسالے کو مولانا سلمان حسینی ندوی صاحب نے پہلی مرتبہ مستقل رسالے کی شکل میں اپنی تعلیقات کے ساتھ "مقدمۃ سنن الترمذی" کے نام سے شائع کیا تھا، جسے احقر نے از سر نو تحقیق اور چند مفید تعلیقات کے ساتھ "المدخل الی دراسۃ جامع الترمذی"

کے نام سے "دار ابن کثیر" (دمشق) سے حال ہی میں شائع کیا ہے، اس میں احقر کا امام ترمذی کے اس رسالہ میں مذکورہ علوم حدیث سے متعلق مباحث پر ایک تحقیقی مقدمہ بھی ہے۔

امام ابوداودؒ (متوفی ۲۷۵ھ) نے بھی اپنی سنن (سنن ابی داود) میں ان اصول کو حسب موقع جگہ جگہ ذکر کیا ہے جس کے اکثر مباحث ان کے کتابچہ "رسالہ الی اھل مکۃ" میں بھی آچکے ہیں، جس کو شیخ عبد الفتاح ابوغدۃ (متوفی ۱۴۱۷ھ) نے اپنی تحقیق وتعلیقات کے ساتھ اپنی کتاب "ثلاث رسائل فی مصطلح الحدیث" میں شامل کرکے شائع کیا ہے۔

اس مرحلے میں علوم حدیث کی بعض اقسام جیسے غریب الحدیث، مشکل الحدیث، ناسخ الحدیث ومنسوخہ، علل الحدیث اور معرفۃ الرواۃ پر مستقل الگ الگ کتابیں لکھی گئیں جن میں اہم کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱- غریب الحدیث: از ابوعبید القاسم بن سلام (متوفی ۲۲۴ھ)۔
۲- الثقات: از ابوحاتم محمد بن حبان البُستی (متوفی ۳۵۴ھ)۔
۳- الضعفاء: از امام محمد بن اسماعیل البخاری (متوفی ۲۵۶ھ)۔
۴- الضعفاء والمتروکون: از امام احمد بن علی بن شعیب النسائی (متوفی ۳۰۳ھ)۔
۵- الطبقات الکبری: از محمد بن سعد کاتب الواقدی (متوفی ۲۳۰ھ)۔
۶- الناسخ والمنسوخ: از ابوبکر محمد بن الاثرم (متوفی ۲۶۱ھ)۔
۷- مختلف الحدیث: از امام محمد بن ادریس الشافعی (متوفی ۲۰۴ھ)۔
۸- شرح مشکل الآثار: از امام ابوجعفر احمد بن سلامۃ الطحاوی (متوفی ۳۲۱ھ)۔
۹- العلل: از امام علی بن عبد اللہ المدینی (متوفی ۲۳۴ھ)۔
۱۰- العلل و معرفۃ الرجال: از امام احمد بن حنبلؒ (متوفی ۲۴۱ھ) وغیرہ۔

دوسری صدی کے اواخر میں مستقل ابواب کی شکل میں علوم حدیث کے بعض مباحث پر تالیفی کام کی ابتدا ہوئی، اس میں سبقت امام بخاریؒ کے استاذ امام علی ابن مدینیؒ (متوفی ۲۳۴ھ) کو حاصل ہے، جنہوں نے علوم حدیث کے متعدد فنون و اقسام پر کتابیں تالیف فرمائیں، جن کا ذکر حاکم نیشاپوریؒ نے "معرفۃ علوم الحدیث" میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

مصطلح حدیث پر تصنیف وتالیف کا آغاز: تیسری صدی کے اختتام تک علما اس علم کے اصول وقواعد کی تدوین کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے رہے، یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری (جو مختلف اسلامی علوم ومعارف کی ترقی کے عروج پر تھی) کے نصف میں مصطلحات حدیث پر باقاعدہ تالیفی کام شروع ہوا، اس زمانے کے چند بڑے علمانے اس علم سے متعلق کئی عمدہ کتابیں تالیف کیں جن میں قابل ذکر مندرجہ ذیل مولفین کی کتابیں ہیں:

۱-امام ابومحمد الحسن بن خلاد الرامہرمزی (متوفی ۳۶۰ھ) کی المحدث الفاصل بین الراوی والواعی جو حدیث کی سماعت وروایت کے اصول وآداب پر لکھی گئی، فنی اعتبار سے پہلی کتاب ہے لیکن مولف اس کتاب میں مصطلح حدیث کی تمام بحثوں کا احاطہ نہیں کرسکے، کیوں کہ جو شخص بھی کسی فن وعلم میں پہلی کتاب لکھتا ہے وہ موضوع کے مکمل احاطہ واستیعاب سے قاصر رہتا ہے، اس کے باوجود متقدمین کے ہاں اس کتاب کو ایک مستقل بنیادی حیثیت حاصل رہی، بعد کے علمانے اسی منہج پر اپنی کتابیں مدون کیں، یہ کتاب استاذ محترم ڈاکٹر محمد عجاج خطیب کی تحقیق کے ساتھ ''دارالفکر'' دمشق سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۲-اس کے بعد ابوعبداللہ حاکم نیساپوریؒ (متوفی ۴۰۵ھ) کی شخصیت کا ظہور ہوا، انہوں نے معرفة علوم الحدیث وكمية أجناسه کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی، جو مصطلح حدیث میں منظم طریقہ سے لکھی جانے والی پہلی کتاب کہلائے جانے کی مستحق ہے، جس میں مولف نے اس علم کی پچاس قسمیں بیان کی ہیں لیکن انہوں نے بھی بہت سی بحثوں کو مرتب نہیں کیا اور نہ ہی اس کو کوئی مناسب فنی ترتیب دی، یہ کتاب پہلی مرتبہ ڈاکٹر معظم حسین کی تصحیح وتحقیق کے ساتھ مدینہ منورہ کے ''المكتبة العلمية'' سے شائع ہوئی۔

۳-ان کے بعد ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) نے حاکم کی اس کتاب پر استدراک کرتے ہوئے جو بحثیں حاکم سے رہ گئی تھیں، ان کا اپنی کتاب المستخرج علی معرفة علوم الحدیث میں ذکر کیا ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

۴-پھر ابوبکر احمد بن علی بن ثابت المعروف بالخطیب البغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کا دور آیا جو ایک زبردست عالم، محدث، فقیہ اور اصولی تھے، انہوں نے بھی الکفایة فی علم

الروایة اور الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع کے نام سے دو کتابیں تحریر فرمائیں، پہلی کتاب مصطلح حدیث کے مسائل سے بھرپور اور روایت کے قواعد کے بیان سے مملو ہے، اس کا شمار اس فن کے اہم ترین مصادر میں ہوتا ہے، یہ کتاب پہلی دفعہ شیخ عبدالرحمان المعلمی کی تحقیق کے ساتھ ''دائرة المعارف'' حیدرآباد سے شائع ہوئی، پھر کئی علما ومحققین نے اپنی تحقیق وتعلیق کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔

دوسری کتاب میں خطیب بغدادی نے حدیث کی روایت سے متعلق بحث کی ہے، یہ اپنے موضوع کی منفرد کتاب ہے، اس میں انہوں نے روایت وسماعت کے متعلق ضروری اصول وقواعد ذکر کیے ہیں، یہ کتاب ڈاکٹر محمود طحان کی تحقیق سے دو جلدوں میں ''مكتبة المعارف'' ریاض سے شائع ہوئی، خطیب بغدادی کے بعد آنے والے علما ان ہی کی کتابوں سے مستفید ہوتے رہے، خطیب نے ان دو کتابوں کے علاوہ علم حدیث سے متعلق ہر فن میں سوائے چند کے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

۵-قاضی عیاض بن موسی الیحصبی (متوفی ۵۴۴ھ) نے ایک کتاب الإلماع الی معرفة أصول الرواية وتقييد السماع کے نام سے تصنیف فرمائی، جس کے اکثر مباحث روایت وسماعت اور اس کے اصول وقواعد پر مبنی ہیں، نظم وترتیب کے اعتبار سے یہ اپنے فن کی بہت عمدہ کتاب ہے، اسے ''دارالتراث'' قاہرہ نے احمد صقر کی تحقیق کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۶-اخیر میں ابوحفص عمر بن عبدالمجید المیانجی (متوفی ۵۸۰ھ) نے ایک مختصر رسالہ مالا يسع المحدث جهله کے نام سے تصنیف کیا جو صرف سات صفحات پر مشتمل ہے، جس میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ حدیث کی چند مصطلحات کی تعریف کی ہے، جسے شیخ عبدالفتاح ابوغدة نے اپنی تحقیق کے ساتھ علوم حدیث سے متعلق چند دوسرے رسائل کے ساتھ شامل کرکے ''خمسة رسائل فی علوم الحدیث'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

مصطلح حدیث کی تکمیل اور اس پر جامع تالیفات: مصطلح حدیث پر باقاعدہ تالیفی کام کا اصل سہرا تو رئیس الاصولیین والمحدثین ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمان الشہرزوری المعروف بابن صلاح (متوفی ۶۴۳ھ) کے ہی سر بندھتا ہے، جنہوں نے علم حدیث پر لکھی گئیں متقدمین کی کتابوں سے

استفادہ کر کے معرفۃ أنواع علوم الحدیث (المعروف بمقدمۃ ابن الصلاح) جیسی بے نظیر کتاب لکھی، جس میں انہوں نے علم حدیث کی ۶۵ قسمیں بیان کیں، اس طرح سابقہ کتابوں میں جو باتیں رہ گئیں تھیں وہ اس میں جمع ہوگئیں لیکن وہ بھی اسے مناسب ترتیب اور اصول پر مرتب نہ کرسکے، کیوں کہ انہوں نے اس کتاب کو اپنے شاگردوں کے لیے بہ تدریج املا کرایا تھا، اس کے باوجود یہ بعد میں آنے والے علما کے لیے ایک عظیم مرجع ثابت ہوئی، اسے استاذ محترم شیخ نورالدین عتر نے اپنی عمدہ تحقیق وتعلیقات کے ساتھ "دارالفکر" دمشق سے شائع کروایا ہے اور بعض دیگر محققین کے ساتھ بھی یہ کتاب شائع ہوچکی ہے۔

بعد میں اس کتاب کے بہت اختصارات کیے گئے اور متعدد علما نے اس پر حواشی بھی لکھے اور اس کو منظوم بھی کیا گیا جن میں سے چند قابل ذکر مندرجہ ذیل ہیں:

مقدمہ ابن الصلاح کے چند مختصرات: ۱- سب سے پہلے امام ابوزکریا محی الدین بن شرف نووی دمشقی (متوفی ۶۷۶ھ) نے مقدمۃ ابن الصلاح کو التقریب والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر والنذیر کے نام سے نہایت عمدگی سے اختصار کیا لیکن بعض مقامات پر عبارت میں کہیں کہیں پیچیدگی پائی جاتی ہے، اس کتاب کو ڈاکٹر مصطفی بغا نے تحقیق کر کے "دارالعلوم الانسانیۃ" دمشق سے شائع کیا۔

بعد میں امام نووی کی اسی کتاب کو حافظ جلال الدین عبدالرحمان بن ابی بکر سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے شرح فرما کر اس کا نام تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی رکھا، جس میں مولف نے فن وموضوع سے متعلق بہت سے فوائد جمع کیے، یہ پہلی مرتبہ شیخ عبدالوہاب عبداللطیف کی تحقیق کے ساتھ مدینہ منورہ کے "المکتبۃ العلمیۃ" سے شائع ہوئی۔

پھر امام نووی نے مقدمہ ابن الصلاح کا ایک اور اختصار ارشاد طلاب الحقائق الی معرفۃ سنن خیر الخلائق ﷺ کے نام سے کیا جسے شیخ نورالدین عتر نے اپنی تحقیق وتعلیقات کے ساتھ دمشق میں شائع کیا، یہ کتاب مبتدئین کے لیے متقدمین کی کتابوں میں نہایت ہی مفید اور بہت آسان ہے اور اس وقت عالم عرب کے دینی مدارس کے نصاب میں بھی داخل ہے۔

۲- ابواسحاق ابراہیم بن محمد المکی الرضی الطبری (متوفی ۷۲۲ھ) نے ایک کتاب الملخص

فی علوم الحدیث کے عنوان سے تالیف کی، جس میں انہوں نے مقدمۃ ابن الصلاح کی تلخیص کی ہے۔

۳- بدرالدین محمد بن ابراہیم بن سعداللہ بن جماعہ کنانی المشہور بابن جماعہ (متوفی ۷۳۳ھ) نے بھی مقدمۃ ابن الصلاح کی تلخیص کی جو المنہل الروی فی علوم الحدیث النبوی کے نام سے معروف ہے اور یہ محی الدین عبدالرحمان رمضان کی تحقیقات کے ساتھ "دارالفکر" دمشق سے شائع ہوچکی ہے، بعد میں اسی کتاب کی شرح ابن جماعہ کے پوتے عزالدین محمد بن ابی بکر بن جماعہ (متوفی ۸۱۹ھ) نے المنہج السوی فی شرح المنہج الروی کے نام سے کی۔

۴- علی بن عثمان الماردینی الحنفی المعروف بابن العلاء الترکمانی (متوفی ۷۵۰ھ) نے مختصر ابن الصلاح کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو غیر مطبوعہ ہے۔

۵- مشہور مفسر ومورخ ابن کثیر عمادالدین اسماعیل بن عمر الدمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) نے بھی ایک کتاب اختصار علوم الحدیث کے نام سے تالیف فرمائی جس کی شرح مصر کے مشہور عالم دین ومحقق علامہ احمد محمد شاکرؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ) نے الباعث الحثیث فی شرح اختصار علوم الحدیث کے نام سے کی، جس میں انہوں نے حدیث کی بہت سے پیچیدہ مصطلحات کی آسان شرح بھی کی ہے، یہ کتاب استاذ محترم ڈاکٹر بدیع سید لحام کی تحقیق سے "دارالسلام" ریاض سے بارہا شائع ہوچکی ہے۔

۶- المقنع فی علوم الحدیث از ابن الملقن سراج الدین ابوحفص عمر بن علی انصاری (متوفی ۸۰۴ھ)، انہوں نے بھی اس نام سے مقدمۃ ابن الصلاح کا اختصار کیا جو شیخ عبداللہ یوسف جدیع کی تحقیق سے "دارفواز" (احساء) سے شائع ہوچکی ہے۔

۷- الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث از شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ الطیبی (متوفی ۷۴۳ھ)، یہ مقدمۃ ابن الصلاح کی نہایت ہی مختصر تلخیص ہے، شیخ صبحی سامرائی کی تحقیق سے یہ کتاب بغداد سے شائع ہوچکی ہے۔

مقدمہ ابن الصلاح پر لکھے گئے چند استدراکات وحواشی: جنہوں نے "مقدمہ ابن الصلاح" کا استدراک کیا اور اس پر حواشی لکھے وہ حسب ذیل ہیں:

۱-ابو محمد عبدالمومن بن خلف الشافعی شرف الدین دمیاطی (متوفی ۷۰۵ھ)۔

۲-شیخ الاسلام سراج الدین ابو حفص بلقینی (متوفی ۸۰۵ھ)، انہوں نے مقدمۃ ابن الصلاح کو محاسن الاصطلاح فی تضمین کتاب ابن الصلاح کے نام سے مختصر کیا اور اس میں چند مفید اضافات بھی کیے، جسے مصر کی مشہور ماہر اسلامیات وادیبہ ڈاکٹر عائشہ بنت عبد الرحمان نے تحقیق کرکے مقدمۃ ابن الصلاح کے ساتھ قاہرہ کی "الھیئۃ العامۃ" سے شائع کیا۔

۳-مغلطائی بن قلیج حنفی (متوفی ۷۶۲ھ) نے بھی چند استدراکات إصلاح ابن الصلاح کے نام سے تحریر کیے جو کہ مفقود ہے۔

۴-بدرالدین محمد بن بہادر زرکشی شافعی (متوفی ۷۹۴ھ) نے النکت علی ابن الصلاح کے نام سے چند فوائد لکھے ہیں جو ڈاکٹر زین العابدین بن محمد بلافریج کی عمدہ تحقیق سے "دار اضواء السلف" ریاض سے شائع ہو چکی ہے۔

۵-زین الدین العراقی ابوالفضل عبدالرحیم بن الحسین (متوفی ۸۰۶ھ) نے التقیید والإیضاح لما أُطلق وأُغلق من کتاب ابن الصلاح کے نام سے استدراکات وحواشی لکھے جو حال ہی میں ڈاکٹر اسامہ بن عبداللہ خیاط (امام وخطیب مسجد حرام) کی عمدہ تحقیق وتعلیقات کے ساتھ "دار البشائر الاسلامیہ" بیروت سے شائع ہوئی۔

۶-حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے الإفصاح بتکمیل النکت علی ابن الصلاح کے نام سے نہایت عمدہ استدراکات لکھے ہیں، جسے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی "المجلس العلمی" نے شیخ ربیع بن ہادی عمیر مدخلی کی تحقیق کے ساتھ شائع کیا۔

مقدمہ ابن الصلاح پر لکھے گئے چند منظومات: بعض علما نے مقدمہ ابن الصلاح کو منظوم بھی کیا، جیسے:

۱-ابوعبداللہ محمد بن احمد بن خلیل بن سعادہ خوینی شافعی (متوفی ۶۹۳ھ) نے مذکورہ کتاب کو أقصی الامل والسول فی علوم أحادیث الرسول کے نام سے (۱۶۰۰) اشعار میں منظوم کیا ہے، یہ کتاب منظومہ خلیل کے نام سے معروف ہے، صاحب کتاب ابن الصلاح کے شاگرد بھی ہیں۔

۲-زین الدین العراقی عبدالرحیم بن الحسین (متوفی ۸۰۶ھ) نے چند اضافات کے ساتھ مقدمہ ابن الصلاح کو نظم الدرر فی علم الأثر کے نام سے منظوم کیا جو ألفیۃ العراقی کے نام سے مشہور ہے، پھر خود ہی اس کی دو شرحیں (مختصر ومطول) لکھیں، مختصر مراکش اور مصر میں شائع ہو چکی ہے، اسی شرح پر برہان الدین البقاعی (متوفی ۸۸۵ھ) نے ایک حاشیہ النکت الوفیۃ بما فی شرح الألفیۃ لکھا، اسی طرح قاسم بن قطلوبغا نے بھی اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے۔

بعد میں حافظ عبدالرحمان سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے عراقی کے اس منظومہ کو فتح المغیث فی شرح ألفیۃ الحدیث کے نام سے لکھا جو مصطلح حدیث پر تالیف کردہ کتابوں میں علمی مواد و فوائد کے اعتبار سے زیادہ مفصل اور جامع کتاب ہے اور محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی کی تصحیح کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، سخاوی کے بعد الشیخ زکریا انصاری (متوفی ۹۲۸ھ) نے بھی فتح الباقی لشرح ألفیۃ العراقی کے نام سے شرح لکھی، یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے، ان کے بعد متعدد علما نے اس منظومہ کی شرحیں لکھی ہیں۔

۳-جلال الدین السیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے حافظ عراقی کے مذکورہ منظومہ کے طرز پر اپنے اضافات کے ساتھ ایک نظم بھی لکھی، بعد میں انہوں نے خود اس کی شرح البحر الذی زخر فی شرح ألفیۃ الأثر کے نام سے کی، جسے وہ مکمل نہ کرسکے، اسے بعد میں علامہ احمد محمد شاکر کی شرح کے ساتھ مصر میں شائع کیا گیا۔

مقدمہ ابن الصلاح کے بعد مصطلح حدیث پر تالیف کردہ مستقل کتابیں: حافظ ابن صلاح کے بعد جن علما نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، انہوں نے ان ہی کے منہج واسلوب کو اختیار کیا لیکن بعض علما نے تصنیف وتبویب میں دوسرا راستہ بھی اپنایا، یہاں ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱-تقی الدین محمد بن علی بن دقیق العید (متوفی ۷۰۲ھ) نے ایک کتاب الاقتراح فی بیان الاصطلاح کے نام سے تصنیف کی، مصطلح حدیث میں یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے، جیسا کہ اس کی واضح مختصر عبارات سے نمایاں ہوتا ہے، کتاب میں مصطلحات کی عمدہ تلخیص کی وجہ سے اس فن کے علما نے اس کتاب پر بہت اعتماد کیا، اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے زین الدین عراقی نے (۴۲۷) اشعار میں اس کو بھی منظوم کیا، ان کے بعد مصنف ابن دقیق العید کے فرزند

ابوزرعہ (متوفی ۸۲۶ھ) نے متفرق جگہوں پر اس کی شرح کی، پھر محمد بن عبدالرحمان سخاویؒ نے اس کی شرح کرکے اس کا نام الإیضاح فی شرح نظم العراقی للاقتراح رکھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن دقیق العید نے اس کتاب میں علوم حدیث سے متعلق اپنی چند آرا کا بھی ذکر کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مصنف محض ایک ناقل یا مقلد ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی ایک ذاتی رائے بھی ہے، اس کتاب کو ڈاکٹر عامر حسن صبری نے اپنی عمدہ تحقیق وتعلیقات کے ساتھ "دارالبشائر الاسلامیہ" بیروت سے شائع کیا ہے۔

۲- السید الشریف علی بن محمد بن علی حسینی جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) نے مختصر فی علوم الحدیث کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس پر ایک عمدہ شرح فخر الہند مولانا عبدالحیؒ لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) نے ظفر الأمانی بشرح مختصر السید الشریف الجرجانی فی مصطلح الحدیث کے نام سے لکھی، جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۳- سراج الدین بن الملقن (متوفی ۸۰۴ھ) نے التذکرۃ فی علوم الحدیث کے عنوان سے ایک مختصر کتاب لکھی، علی حسن علی عبدالحمید نے اپنی تحقیق کے ساتھ "دارعمان" عمان (اردن) سے اسے شائع کیا۔

۴- محمد بن ابراہیم المعروف بابن الوزیر الصنعانی (متوفی ۸۴۰ھ) نے تنقیح الأنظار کے نام سے ایک جامع دقیق متن لکھا، پھر امیر محمد بن اسماعیل صنعانی (متوفی ۱۱۸۲ھ) نے توضیح الأفکار کے نام سے اس کی ایک عمدہ شرح لکھی جس میں انہوں نے جگہ جگہ علمائے زیدیہ کے مذاہب کا بھی ذکر کیا، جو مصر کے مشہور عالم وممتاز محقق شیخ محمد محی الدین عبدالحمید کی تحقیق وتعلیقات کے ساتھ "مکتبۃ الخانجی" قاہرہ سے شائع ہوچکی ہے۔

۵- حافظ احمد بن علی بن محمد بن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے نخبۃ الفکر فی مصطلح أهل الأثر کے نام سے ایک مختصر وجامع متن لکھا جو ترتیب کے اعتبار سے مختصرات میں سب سے زیادہ مفید اور عمدہ ہے، اس میں تقسیم وترتیب کے طریقے کے اعتبار سے وہ پچھلے مصنفین پر سبقت لے گئے، پھر انہوں نے خود اس کی شرح نزهة النظر کے نام سے لکھی، شام کے مشہور عالم دین ومحقق شیخ نورالدین عتر نے دونوں کو یکجا کرکے اس کی تحقیق اپنی عمدہ تعلیقات

کے ساتھ شرح النخبۃ نزهة النظر فی توضیح نخبۃ الفکر کے نام سے شائع کیا، اسی طرح دیگر علما نے بھی اپنی تحقیق وتعلیق کے ساتھ یہ کتاب شائع کی ہے لیکن شیخ عتر کی تحقیق والا نسخہ افادی حیثیت سے سب سے اہم ہے، اس کے بعد متعدد علما نے نزهة النظر کی کئی شرحیں لکھیں، جن میں قابل ذکر عبداللہ بن الحسین سمین عدوی (متوفی ۱۳۰۹ھ) کی لقط الدرر اور کمال الدین شمنی کے اس پر حواشی اور نورالدین ابوالحسن علی بن سلطان محمد الہروی الحنفی المشہور بہ علی القاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) کی مصطلحات أهل الأثر علی شرح نخبۃ الفکر اور محمد اکرم ابن عبدالرحمان نصرپوری سندھی (متوفی ۱۲۵۷ھ) کی إمعان النظر بشرح نخبۃ الفکر ہیں، شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی شرح بھی نہایت اہم ہے، اسی طرح علامہ عبدالرؤف مناوی کی شرح الیواقیت والدرر بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

علم مصطلح حدیث پر لکھے گئے بعض منظومات: بعض علما نے اس فن کو منظوم کرنے میں ایک انوکھا راستہ بھی اپنایا، جیسے:

۱- حافظ شہاب الدین احمد بن فرج اندلسی (متوفی ۶۹۹ھ) نے غرامی صحیح کے نام سے ایک قصیدہ لکھا، جس میں علوم حدیث کی تمام قسمیں بیان کیں، بعد کے علما نے اس کی شرحیں بھی لکھیں ہیں جن میں قابل ذکر دمشق کے مشہور محدث علامہ محمد بدرالدین بن یوسف حسینی (متوفی ۱۳۴۵ھ) کی شرح ہے۔

۲- عمر بن محمد فتوح بیقونی دمشقی (متوفی ۱۰۸۰ھ) نے (۳۴) اشعار میں حدیث کی تمام اہم قسموں کو منظوم کیا جو المنظومۃ البیقونیۃ کے نام سے مشہور ومتداول ہے، اس کا شمار مفید اور مشہور مختصرات میں ہوتا ہے، اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں جن میں مشہور وقابل ذکر شرح حلب کے مشہور ومعروف عالم، مفسر ومحدث شیخ عبداللہ سراج الدین (متوفی ۱۴۲۳ھ) نے کی ہے، جو مبتدین کے لیے نہایت مفید ہے۔

عصر جدید میں مصطلح حدیث پر علما کی خدمات: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ کی حفاظت کے لیے ہر زمانے میں ایسی شخصیات کو وجود بخشا، جنہوں نے اس خوش گوار فریضے کو دل وجان سے ادا کیا اور دشمنوں کے مکر وفریب سے اس کو بچایا، ہمارا زمانہ بھی ایسے علما سے خالی

نہیں رہا، ان میں سے چند خوش نصیب اہل فضل وکمال کی اہم کتابوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

۱-توجیه النظر الی علوم الاثر ازعلامہ شیخ طاہر جزائری دمشقی (متوفی ۱۳۳۸ھ)، انہیں اگر اس فن کا خاتم المولفین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، انہوں نے حاکم نیساپوری کی معرفة علوم الحدیث و كمية أجناسه اور مقدمة ابن الصلاح دونوں کو اپنی اس کتاب کا جامع بنایا اور خود بھی بہت سے نفیس افادات کا اس میں اضافہ کیا ہے اور علوم حدیث کے بعض پیچیدہ مسائل وابحاث کی خوب وضاحت اور تحقیق کی ہے، یہ کتاب شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں "مکتبۃ المطبوعات الاسلامیہ" حلب سے شائع ہو چکی ہے۔

۲- قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث ازعلامۃ الشام شیخ محمد جمال الدین قاسمی (متوفی ۱۳۳۲ھ)، یہ کتاب اپنی ترتیب وتبویب اور تہذیب کے لحاظ سے بڑی خوبیاں رکھتی ہے اور یہ فن میں موجودہ مولفین کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے، حال ہی میں اس کا ایک تحقیق شدہ عمدہ ایڈیشن صدیق محترم مصطفیٰ شیخ مصطفیٰ کے اہتمام سے "مؤسسة الرسالة" بیروت سے شائع ہوا۔

۳-علوم الحدیث و مصطلحه ازڈاکٹر صبحی صالح (متوفی ۱۴۰۳ھ)، اس کتاب میں فاضل مصنف نے مصطلح حدیث سے متعلق اس قدر معلومات ومباحث پیش کیے ہیں کہ شاید ہی دوسرے معاصر کی کتابوں میں موجود ہوں، یہ کتاب علمی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی اور متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا، یہ "دار العلم للملایین" بیروت سے بارہا شائع ہو چکی ہے۔

۴-الوسیط فی علوم الحدیث از شیخ محمد بن محمد ابوشہبہ (متوفی ۱۴۰۳ھ)، علوم حدیث میں لکھی جانے والی کتابوں میں یہ ایک جامع اور عمدہ کتاب ہے، فاضل مولف نے جامعہ ازہر اور مدینہ یونی ورسٹی میں اپنے علوم حدیث کے تدریسی تجربوں کی روشنی میں یہ کتاب تالیف کی ہے، سعودیہ سے یہ متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

۵-لمحات فی اصول الحدیث ازڈاکٹر محمد ادیب صالح، دراصل اس کتاب کے مباحث مولف کے ان محاضرات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے کلیة الشریعة، جامعہ دمشق میں علم حدیث سے متعلق دیے تھے، یہ کتاب عام فہم اور مفید مباحث پر مشتمل ہے، اور "المکتب الاسلامی" بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔

۶- اصول الحدیث علومه و مصطلحه از استاد محترم ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب، اس کتاب میں مولف نے ہر مصطلح کی جامع ترین تعریف لکھی ہے، کتاب کے شروع میں تدوین حدیث پر بڑی عمدہ بحث ہے اور اس کے اخیر میں صحابہ وتابعین کے تذکرے بھی خوب ہیں، "دار الفکر" دمشق سے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

۷- تیسیر مصطلح الحدیث ازڈاکٹر محمود طحان، اس موضوع پر عصر حاضر کی تالیفات میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، مولف نے اس کتاب میں ہر بحث کی مختصر اور جامع تقسیم کی، تاکہ طلبا کے لیے اس کا سمجھنا آسان ہو اور ہر بحث کو تعریف ومثال وغیرہ سے عام فہم انداز میں پیش کیا اور اختصار سے اس فن کی تمام بحثوں کا احاطہ کیا، کتاب کی تبویب وترتیب میں مولف نے حافظ ابن حجر کی نخبة الفکر سے استفادہ کیا ہے اور یہ کتاب "مکتبۃ المعارف" ریاض سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

۸- الإیضاح فی علوم الحدیث والاصطلاح از استاذان محترمان ڈاکٹر مصطفیٰ سعید خن وڈاکٹر السید بدیع اللحام، یہ حال ہی میں شائع ہونے والی کتابوں میں ایک مفید اور جامع کتاب ہے، اس میں علم مصطلح حدیث کا بہ خوبی احاطہ کیا گیا ہے، موضوع کی ترتیب جدید ہے لیکن عبارتیں متقدمین کی ہی ہیں، یہ کتاب "دار القلم الطیب" دمشق سے طبع ہو چکی ہے۔

جدید طرز پر مرتب کردہ چند اہم کتابیں: بعض مولفین نے اصول حدیث میں ترتیبی طریقہ کو اپنایا ہے اور انہوں نے اصول حدیث کی کئی قسمیں کیں، جیسے علوم الروایة، علوم الرواة، رد و قبول کے اعتبار سے حدیث کی انواع، علوم متن، علوم السند، متن وسند کے درمیان مشترک علوم وغیرہ، اس طرز پر لکھی ہوئی اہم کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱- المنهج الحدیث فی عاوم الحدیث ازعلامہ شیخ محمد بن محمد سماحی (متوفی ۱۴۰۴ھ)، جدید طرز پر علوم حدیث کو مرتب کرنے کی اولیت اسی کتاب کے فاضل مولف کو ہے، جنہوں نے بڑی عمدگی سے علوم روایہ ودرایہ کو دو جلدوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کی بڑی مفصل تعریف کی ہے، س کتاب کا پہلا ایڈیشن مولف نے قاہرہ سے شائع کروایا تھا، اس کے بعد دوبارہ شائع نہ ہو سکی۔

۲- منہج النقد فی علوم الحدیث از استاذ محترم ڈاکٹر شیخ نور الدین عتر، اس طرز پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول اور متداول ہے، یہ کتاب ''دار الفکر'' دمشق سے طبع ہوچکی ہے۔

۳- المنہج الحدیث فی علوم الحدیث از ڈاکٹر شرف قضاۃ (مطبوعہ الادیمیون للنشر عمان، اردن)۔

۴- المنہج الحدیث فی تسہیل علوم الحدیث از ڈاکٹر علی نایف بقاعی (مطبوعہ دار البشائر الاسلامیۃ، بیروت) مبتدئین کے لیے یہ نہایت مفید کتاب ہے، جس میں خود مولف نے مصطلح حدیث کی تدریس کے اپنے ذاتی تجربوں کی روشنی میں کتاب تالیف کی ہے۔

مصطلح حدیث پر تیار کیے گئے چند معاجم: علوم حدیث کی اہم مصطلحات کو حروف تہجی کی ترتیب اور معجم کے طرز پر تیار کرنے کا سہرا شام کے مشہور عالم دین و محقق شیخ نور الدین عتر کے سر ہے جنہوں نے دمشق کی مجمع اللغۃ العربیۃ کی خواہش پر اس طرح کی ایک معجم معجم المصطلحات الحدیثیۃ کے نام سے مع فرنچ ترجمے کے تیار کی تھی لیکن ان کا یہ کام اس قدر مختصر تھا کہ وہ اس فن سے ذوق و مناسبت رکھنے والوں میں زیادہ مقبول نہیں ہوسکا لیکن ان کی یہ اولین سعی آئندہ اس طرز پر کام کرنے کے لیے معاون ضرور ثابت ہوئی، ان کے بعد دیگر علمائے حدیث نے بھی اسی نہج پر متعدد معاجم تیار کیں، جو مقبول بھی رہیں، ان میں قابل ذکر مندرجہ ذیل ہیں:

۱- معجم مصطلحات الحدیث از سلیمان مسلم الحراش و حسین اسماعیل الجمل (مطبوعہ مکتبۃ العبیکان، ریاض)۔

۲- معجم المصطلحات الحدیثیۃ از ڈاکٹر محمود طحان، ڈاکٹر عبد الرزاق خلیفہ شائجی اور ڈاکٹر عبد الحلیم عبید (مطبوعہ کلیۃ الشریعہ، جامعۃ الکویت)۔

۳- قاموس مصطلحات الحدیث النبوی از شیخ محمد صدیق منشاوی (مطبوعہ دار الفضیلۃ، قاہرہ)۔

۴- معجم علوم الحدیث النبوی از ڈاکٹر عبد الرحمان بن ابراہیم خمیسی (مطبوعہ دار ابن حزم، بیروت)۔

۵- معجم المصطلحات الحدیثیۃ از ڈاکٹر ابو اللیث خیر آبادی (مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ، بیروت)۔

۶- معجم مصطلحات الحدیث ولطائف الأسانید از ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمان اعظمی (مطبوعہ دار ابن حزم، بیروت)۔

۷- معجم المصطلحات الحدیثیۃ از سید عبد الماجد غوری (مطبوعہ دار ابن کثیر، دمشق)۔

۸- موسوعۃ علوم الحدیث وفنونہ از سید عبد الماجد غوری (مطبوعہ دار ابن کثیر، دمشق)۔

مذکورہ بالا کتابوں میں اس طرز پر سب سے زیادہ وسیع و مفصل کام موخر الذکر کتاب میں ہے، جو تین جلدوں میں علوم حدیث کی عام و خاص مصطلحات و رموز پر مشتمل ہے اور اس میں ہر مصطلح کی مفصل علمی تعریف بیان کی گئی ہے، اس کتاب کی پہلی جلد میں مولف کا سو صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی ہے، جس میں ''علم مصطلح حدیث'' کی تاریخ اور مختلف ادوار میں اس پر لکھی گئی کتابوں کا جامع تعارف ہے۔

عصر قدیم و جدید میں مصطلح حدیث پر علمائے ہند کی تالیفی خدمات: عصر قدیم و جدید میں ہمارے علما کی بھی مصطلح حدیث پر نمایاں تالیفی خدمات رہی ہیں، اگرچہ ان میں اکثر کا کام حافظ ابن حجر کی نخبۃ الفکر کی شرح پر ہی منحصر رہا لیکن بعض علما نے بعد میں اس فن پر مستقل کتابیں بھی تصنیف کیں، شرح نخبہ پر درج ذیل کام ہوئے ہیں:

۱- شرح علی شرح النخبۃ از شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ)۔

۲- إمعان النظر فی توضیح نخبۃ الفکر از شیخ محمد اکرم بن عبد الرحمان سندھی، اس کا شمار ''نخبہ'' کی بہترین شرحوں میں ہوتا ہے جو مولانا ابو سعید غلام مصطفیٰ کی تحقیق سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد (سندھ) سے شائع ہوچکی ہے۔

۳- شرح النخبۃ از شیخ عبد النبی بن عبد اللہ شطاری گجراتی۔

۴- حاشیہ علی شرح النخبۃ از شیخ عبد اللہ بن صابر ٹونکی۔

مصطلح حدیث پر علمائے ہند کی مستقل کتابیں: ۱- المنہج از شیخ نظام الدین بن سیف علوی کاکوروی (متوفی ۹۸۱ھ)۔

۲- مختصر فی علوم الحدیث از شیخ سلام بن شیخ الاسلام دہلوی (متوفی ۱۲۲۹ھ)۔

۳- مختصر از نورالاسلام رام پوری۔

۴- مقدمہ فی اصول الحدیث از شیخ عبدالحق دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ)، یہ کتاب استاذ محترم حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب کی تحقیق وتعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی تھی، اسی کو بعد میں چند مزید تعلیقات کے ساتھ احقر نے ''دار ابن کثیر'' دمشق سے شائع کیا ہے، اس کتاب کی مولانا نعیم الاحسان مجددی نے بھی ایک شرح لکھی ہے جس کو مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی مرتب کررہے ہیں۔

۵- بلغة الأريب فی مصطلح آثار الحبیب از سید مرتضیٰ بن محمد حسینی بلگرامی زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ)۔

۶- الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل از شیخ عبدالحئی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ)، ابن ابی حاتم رازی کی تقدمة الجرح والتعدیل کے بعد اس موضوع پر لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے جس میں مولف نے موضوع کے متعلق ساری اہم بحثوں کو یک جا کردیا ہے۔

۷- ظفر الأمانی بشرح مختصر السید الشریف الجرجانی فی مصطلح الحدیث از علامہ عبدالحئی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ)، اس میں مولف نے مصطلح حدیث کے بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل سے بحث کی ہے جن میں علما کا اختلاف رہا، مثال کے طور پر عقائد کے علاوہ حدیث ضعیف پر جواز کا عمل، اسما وصفات وغیرہ، اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مولف نے مسائل میں بحث کے دوران صرف محدثین کے اقوال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ فقہا واصولیین کی رائیں نقل کرکے اور فن کی بہت سی قسموں (جیسے حسن، ضعیف، موضوع، مضطرب ومدرج) پر امثال وشواہد کے ذریعے بڑی مفصل بحث کی ہے، اس کتاب کو بہترین تحقیق اور بلند پایہ تعلیق کے ساتھ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری نے بیروت سے خوب صورت طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۸- قواعد فی علوم الحدیث از علامہ ظفر احمد تھانوی (متوفی ۱۳۹۴ھ)، دراصل یہ مولف کی مذہب حنفی کی تائید پر مشتمل احادیث کے ایک زبردست موسوعی مجموعہ

اعلاء السنن کا مقدمہ ہے جو اس کے ساتھ انہاء السکن الی من یطالع اعلاء السنن کے نام سے شائع ہوا تھا، پھر اسے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے قواعد فی علوم الحدیث کے نام سے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کیا، اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولف نے اس میں جگہ جگہ احناف کے اصول بھی ذکر کیے ہیں۔

۹- مبادئ علم الحدیث از علامہ شبیر احمد عثمانی (متوفی ۱۳۶۹ھ)، درحقیقت یہ فتح الملہم فی شرح صحیح مسلم کا مقدمہ ہے، اس کی اکثر بحثیں علامہ طاہر جزائری کی توجیہ النظر الی اصول الاثر کے طرز پر ہیں۔

اخیر کی پانچ کتابیں ممتاز محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (متوفی ۱۴۱۷ھ) کی تحقیق و تدقیق اور عمدہ تعلیقات کے ساتھ ''مکتبة المطبوعات الاسلامیة'' حلب سے شائع ہوچکی ہیں۔

۱۰- علوم الحدیث أصیلها ومعاصرها از ڈاکٹر محمد ابواللیث خیرآبادی، مولف نے اس کتاب میں علوم حدیث کو عصری اسلوب میں آسان بنانے کی سعی کی ہے اور اس میں موضوع سے متعلق چند موضوعات کا بھی اضافہ کیا ہے، یہ کتاب مؤسسة الرسالة (بیروت) سے شائع ہوچکی ہے۔

۱۱- المدخل الی دراسة علوم الحدیث از سید عبدالماجد غوری، علم مصطلح حدیث پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ (۱۴۰۰) صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب ہے، مولف نے اس میں حدیث کے روایت ودرایت سے متعلق ہر علم کی جامع تعریف مع مفید امثلہ وشواہد بیان کی ہے اور اس کے متعلق لکھی گئیں مطبوعہ ومخطوطہ کتابوں کا بھی جائزہ لیتے ہوئے تعارف کرایا ہے، یہ کتاب ''دار ابن کثیر'' دمشق سے شائع ہوچکی ہے۔

مختصر یہ کہ ''علم مصطلح حدیث'' کا نشوونما عہد اول ہی سے سنت مطہرہ کے وجود سے ہوا، اس نے سنت رسول کی حفاظت کی اور کذب وافترا، تبدل وتغیر اور ہر قسم کی تحریف سے اس کو محفوظ رکھا اور دین سے غیر متعلق چیزوں کو دور کیا، اس مقالہ میں علم مصطلح حدیث سے متعلق صرف عربی زبان میں لکھی گئی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے، اگرچہ اردو زبان میں بھی اس علم سے متعلق کتابوں کا عظیم ذخیرہ موجود ہے لیکن یہاں اس کا ذکر عمداً نہیں کیا گیا ہے، انشاء اللہ اس موضوع پر مفصل

بحث کسی اگلے شمارے میں کی جائے گی۔

مصادر و مراجع

(۱) فتح الباری (۱/ ۱۹۳)۔(۲) دیکھیے: فتح الملھم ۔(۳) رواہ البخاری ، کتاب العلم، باب الحرص علی الحدیث ، رقم: ۹۹۔(۴) علوم الحدیث و مصطلحہ از ڈاکٹر صبحی صالح، ص ۱۱۳۔(۵) رواہ البخاری ، باب کیف کان بدء الوحی ۔(۶) السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، ص ۵۹۔(۷) تدوین حدیث از مولانا مناظر احسن گیلانی، ص ۹۔(۸) درس ترمذی از مولانا محمد تقی عثمانی (۱/ ۲۳-۲۵)۔(۹) توجیہ النظر از شیخ طاہر الجزائری، ص ۲۱۔(۱۰) دیکھیے مقدمۃ جامع الاصول (۱/ ۱۳۰)۔(۱۱) مقدمۃ فتح المغیث، ص ۳۔(۱۲) تدریب الراوی (۱/ ۲۴۵) ۰۱۳) ایضاً (۲/ ۲۴۵)۔(۱۴) الرسالۃ از امام شافعیؒ، ص ۱۱۶۔

تذکرۃ المحدثین (حصہ اول، دوم، سوم)

از: ضیاء الدین اصلاحی

حصہ اول: اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قیمت: =/۶۵ روپے

حصہ دوم: اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی علمی و حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قیمت: =/۱۶۰ روپے

حصہ سوم - یعنی محدثین ہند جلد اول: اس میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادۂ شیخ عبدالحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحب تصانیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی علمی و دینی اور محدثانہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قیمت: =/۱۲۵ روپے

عربی قصہ نگاری - مختصر تعارف

پروفیسر محمد اقبال حسین ندوی[*]

قصہ کی روایت عربی زبان میں بہت قدیم ہے، عہد جاہلی اور عصر اسلامی تک قصہ "مسامرۃ" (یعنی شب کی مجلسوں کی قصہ گوئی) تک محدود تھا، جب عصر اموی میں زبان وادب نے تحریری شکل اختیار کی تو اس کے بعد کے دور میں قصہ نگاری نثری ادب کا موثر اور طاقت ور حصہ بن کر سامنے آئی، کلیلہ ودمنہ اور دوسرے مشہور قصوں کے علاوہ عصر عباسی کی ایک ادبی یادگار الف لیلۃ ولیلۃ ہے، جس کا شمار سماجی ثقافت کی علامت کے طور پر ہوتا ہے، عصر عباسی میں قصہ کے میدان میں سب سے اہم کارنامہ مقامہ نویسی ہے، بدیع الزماں ہمدانی نے دسویں صدی کے اواخر میں چالیس مقامات لکھے اور اس کی پیروی میں حریری نے بھی مقامات لکھے۔

مقامہ ایسی کہانی کو کہتے ہیں جو ایک ہی مجلس میں سنائی جائے، بدیع الزماں ہمدانی اور دوسرے مقامہ نویسوں کے ہر مقامہ میں ایک راوی ہوتا ہے، کہانی ایک ہیرو کے ارد گرد گھومتی ہے، جس کا کردار اس دور کی سماجی زندگی کے عیوب کی عکاسی کرتا ہے، مقامہ کی زبان اور اسلوب نہایت پر تکلف مسجع ومقفی اور صنعت لفظی سے پر ہوتا ہے، اس میں فکری آگہی کم اور زبان کی صنعت گری زیادہ پائی جاتی ہے، اندلس کی سرزمین پر ابن حزم نے طوق الحمامۃ اور ابن طفیل نے حی بن یقظان جیسے قصے لکھے، پہلا قصہ محبت کی داستان اور دوسرا قصہ خالق کائنات کے اثبات کے فلسفہ پر مبنی ہے۔

عربی میں قصہ نگاری کے نئے دور کا آغاز انیسویں صدی کے اخیر میں ہوا اور بیسویں صدی میں یہ اپنے عروج کو پہنچ گیا، بیسویں صدی میں عربی میں قصہ کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے

[*] سیفل، حیدرآباد۔

لیے استعمال کیا گیا، ناول اور افسانہ میں فرق کے لیے ناول کو روایہ کہا گیا اور افسانہ کے لیے قصہ،
قصیرہ اور اقصوصہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، بعض ناقدوں نے کہا کہ جب کوئی قصہ فنی معیار پر
پورا اترے تو وہ روایہ ہے ورنہ وہ قصہ ہے، اس لیے کوئی واضح تعریف پیش کرنا یہاں مشکل ہے۔

انیسویں صدی میں لبنان اور شام کی سرزمین میں عیسائی مشنریوں نے علم وثقافت کی
ترقی کی طرف توجہ دی، ناصف الیازجی (۱۸۰۱-۱۸۷۱) نے مقامات حریری کے فرانس سے
شائع شدہ ایڈیشن کا مطالعہ کیا، اس سے متاثر ہوکر اس نے بھی مقامات تحریر کیے اور ۱۸۵۶ء میں
ان کا ایک مجموعہ ''مجمع البحرین'' کے نام سے شائع کیا، اس کے ہم عصر لبنانی مصنف احمد فارس
الشدیاق (۱۸۰۴-۱۸۸۷ھ) نے ''الساق علی الساق فیما ہو الفاریاق'' کے عنوان سے قدیم
اسلوب میں مقامات لکھے اور اس میں سماجی و مذہبی انتہا پسندی کو موضوع بنایا۔

فرانسس مراش نے ''غابۃ الحق'' کے عنوان سے ایک قصہ ۱۸۶۵ء میں شائع کیا جس
کا بنیادی موضوع آزادی رائے ہے، مراش کا دوسرا قصہ ''درر الصدف فی غرائب الصدف''
۱۸۷۲ء میں بیروت سے شائع ہوا، اس کے علاوہ سلیم البستانی نے پندرہ روزہ مجلہ ''الجنان'' میں
قسط وار کہانیاں شائع کی، ان کہانیوں میں ''الہیام فی جنان الشام'' کہانی کو شہرت ملی، ۱۸۵۰ء
کے بعد لبنان اور شام کے حالات سماجی اور سیاسی اعتبار سے کچھ ایسے ہوگئے کہ وہاں نے مصر اور
امریکا کا رخ کیا، جبران جیسی شخصیت نے امریکا میں قصہ کے فن کو پروان چڑھایا اس کے علاوہ
بڑی تعداد میں لبنانی اور شامی ادبا مصر بھی منتقل ہوگئے۔

لبنان اور شام میں ثقافتی تبدیلی عیسائی مشنریوں کی وجہ سے آئی اور مصر میں انقلاب
اٹھارہویں صدی کے اخیر میں نپولین کے حملہ کے بعد آیا، فرانس سے ثقافتی لین دین اور لبنانی ادبا
کی مصر میں آمد کی وجہ سے یہاں کی صحافت اور ادب کو ابھرنے کا موقع ملا، سعید البستانی نے اپنی
کہانیوں ''ذات الخدر'' اور ''الاہرام'' کو ۱۸۸۴ء میں قسط وار شائع کیا، اس طرح مصر میں کہانیوں
کا آغاز ہوا، جب محمد علی نے مصر کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس نے طلبہ کو اعلا تعلیم کے لیے
فرانس روانہ کیا، اس کا اثر ادب وثقافت دونوں پر پڑا، رفاعہ طہطاوی کی شخصیت ان تعلیم یافتہ
افراد میں نمایاں تھی، اس نے Fenelon کی کتاب "Les Aventures De Telemaque" کا

ترجمہ عربی زبان میں کیا، اس کے شاگرد عثمان جلال نے Moliere کے ڈراموں اور Lafontaine
کی کہانیوں کے ترجمے کیے، اسی طرح Alexandre Dumas کے ناول Jules Verne کا
ترجمہ نجیب حداد نے الفرسان الثلاثۃ کے نام سے کیا، مصر میں انیسویں صدی میں ایک اہم نام علی
مبارک (۱۸۲۴-۱۸۹۳ء) کا بھی ملتا ہے، اس کے علمی کارناموں میں اس کی کتاب ''علم
الدین'' مشہور ہے جس کی حیثیت یورپ کے سفرنامہ کی ہے لیکن اس کا انداز ناول کا ہے جس کے
ہر باب کو مسامرہ کا عنوان دیا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا انیسویں صدی کے اخیر میں جب صحافت کے دور کا آغاز ہوا تو مسجع
ومقفی اور محسنات لفظیہ سے بوجھل زبان کی بہ جائے رفتہ رفتہ آسان اسلوب اور طرز ادا کی طرف
توجہ دی جانے لگی، انگریزی اور فرانسیسی ثقافت کے اثر سے قصہ نویسی کی طرف بھی توجہ دی گئی،
قصہ نگاری کے لیے ایک طرف قرآن کریم، الف لیلۃ ولیلۃ اور مقامات وغیرہ قدیم عربی قصوں
سے صرف نظر نہیں کیا گیا تو دوسری طرف انگریزی اور فرانسیسی ادب سے خوب استفادہ کیا گیا۔

مصر پر نپولین کے حملے کے بعد مصر کے روابط فرانس سے قائم ہوئے اور خطہ شام یعنی
موجودہ لبنان اور شام کے علاقے میں مسیحی مشنریوں کے ذریعہ مغربی ثقافت کے عام کرنے کی
کوشش کا اثر تھا کہ مشہور شاعر حافظ ابراہیم نے ڈاکٹر ہیوگو کے ناول Lesmiserable کا ترجمہ
''البؤساء'' کے عنوان سے کیا، فرح انطونی نے بول وفرجینی کی کتاب کا ترجمہ ''الفضیلۃ'' کے نام
سے کیا، اس کے علاوہ لبنانیوں نے بڑی تعداد میں انگریزی قصوں کا ترجمہ کیا اور یہ قصے
''المقتطف، الجنان اور الہلال'' جیسے روزناموں اور ماہناموں میں قسط وار شائع ہوئے، ان
ترجموں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

۱- پہلے دور میں جو ترجمے کیے گئے وہ زبان وبیان کے اعتبار سے بہت ناقص تھے۔

۲- دوسرے دور میں جو ترجمے کیے گئے وہ اصل کے مطابق کم اور عربی ذہن وفکر اور
زبان کی رعایت کے زیادہ غماز ہیں، قصہ کے پلاٹ، کردار اور اسلوب میں بڑی تبدیلی صاف
ظاہر ہے۔

۳- تیسرے دور میں مترجمین نے ترجمہ کرنے کی بجائے قصہ کو پڑھ کر اپنے فکر اور

اسلوب میں کہانی کو ڈھال کر طبع زاد قصے کی شکل دے دی۔

جن ادیبوں نے تصنع وتکلف اور سجع کے بجائے آسان اسلوب میں مغربی کہانیوں کے ترجمے اس انداز سے پیش کیے کہ وہ طبع زاد سمجھے جاسکیں، ان میں لطفی المنفلوطی (۱۸۷۶-۱۹۲۴ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، وہ اگرچہ مغربی زبانوں سے زیادہ واقف نہیں تھے، اس کے باوجود ان سے واقفیت حاصل کرکے خوب صورت انداز میں اچھی کہانیاں پیش کیں، النظرات ان کی شاہ کار کتاب ہے۔

انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں قدیم افکار وخیالات اور جدید نظریات کی کشمکش شروع ہوگئی، جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی اصلاحات کا اثر طاقت ور تھا تو جدید افکار ونظریات کے قائل ادیبوں اور شاعروں جیسے قاسم امین (۱۸۶۵-۱۹۰۸ء)، شاعر النیل حافظ ابراہیم (۱۸۷۱-۱۹۳۲ء)، مصطفیٰ کامل (۱۸۷۴-۱۹۰۸ء) اور محمد المویلحی (۱۸۵۸-۱۹۳۰ء) نے نئی نسل کو اپنے اسلوب اور خیالات سے متاثر کرنے میں کامیابی حاصل کی، محمد المویلحی کی کتاب ''حدیث عیسی ابن ہشام'' قصہ نگاری کے میدان میں اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے، اس کا انداز مقامہ کا ہے لیکن اس میں معاشرہ کے سماجی حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب قصہ نگاری کے میدان میں ایک پیش رفت سمجھی گئی، حافظ ابراہیم نے ''لیالی سطیح'' میں انگریزوں کے جبر واستبداد، غیر ملکی حکم رانوں کی ناانصافی اور عورتوں کی تعلیم اور حقوق کے مسائل کو موضوع بنایا ہے، محمد لطفی جمعہ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) کا ناول ''لیالی روح الحائر'' ۱۹۱۲ء میں منظر عام پر آیا، اس میں معاصر سماجی وسیاسی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے، جدید مقامہ کے انداز اور اسلوب میں ان ہی دنوں میں عراق میں سلیمان فیضی الموصلی نے اپنا ناول ''الروایۃ العقازیۃ'' (Al-Iqaziyyah) تحریر کیا، علی الدجیلی نے تونس میں ''جولۃ حول حانات البحر الابیض المتوسط'' کے عنوان سے عمدہ ناول لکھا اور محمد ابن عبداللہ المواقیت نے مراکش میں ''الرحلۃ المراکشیۃ او مراۃ المسائل الواقعیۃ'' (سفرنامہ مراکش یا معاصر مسائل کا آئینہ) کے نام سے ۱۹۲۰ء میں ایک ناول سپرد قلم کیا۔

لبنانی نژاد معروف اہل قلم جرجی زیدان نے انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی

کی ابتدا میں انگریزی کے ناول نگار اسکاٹ کے ناولوں کے طرز پر تاریخی ناول لکھے، اس نے ارمانوسہ المصریۃ، الحجاج بن یوسف، شجرۃ الدرر، استبداد الممالیک وغیرہ، ناولوں میں عرب ملکوں کے قدیم تاریخی واقعات اور سیاسی حالات کی تصویر کشی کی، اس کے ناولوں کی زبان آسان اور اسلوب عام فہم ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ فنی معیار ومیزان پر یہ ناول پوری طرح کھرے نہیں اترتے۔

لبنان ہی کی سرزمین پر چند ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں سماجی اصلاحات اور واقعہ نگاری کے ساتھ ہی قاری کے لیے مسرت وفرحت کا سامان بھی مہیا کیا، کچھ ناول ''الروایۃ الشہریۃ'' یعنی ماہنامہ ناول کے طور پر رسائل میں شائع ہوئے، نقولا حداد (۱۸۷۲-۱۹۵۴ء) نے ''حواء الجدیدۃ'' (۱۹۰۶ء) ''اسرات الحب'' اور ''فطنات الامبراطور'' (۱۹۲۲ء) جیسے ناول لکھے، یعقوب صروف (۱۸۵۲-۱۹۲۷ء) اور فرح انطون (۱۸۷۴-۱۹۲۲ء) نے تاریخی ناول نگاری ہی کو پسند کیا، فرح انطون نے ناول ''امیر لبنان'' میں لبنان کے انیسویں صدی کے مذہبی گروہی تصادم کو اور ''یوروشلم الجدیدۃ وفتح العرب بیت المقدس'' میں قدیم عربی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا، صروف نے ''فتاۃ مصر'' (مصر کی دوشیزہ ۱۹۰۶ء) اور ''فتاۃ الفیوم'' (فیوم کی دوشیزہ ۱۹۰۸ء) میں اپنے وقت کے سماجی، مادی وجسمانی تقاضوں کی طرف توجہ دی، فرح انطون نے اپنے ناول ''العلم والدین والمال'' (سائنس، علم اور مال وزر ۱۹۵۱ء) میں سائنس اور مذہب کی کشمکش کو آشکارا کرنے کی کوشش کی، یہ اس کا اپنا ذاتی نظریہ تھا، انطون نے اپنے دو ناول ''الحب حتی الموت'' (محبت موت تک ۱۸۹۸ء) الوحش، الوحش، الوحش (دہشت، دہشت، دہشت ۱۹۰۳ء) میں امریکہ ہجرت کرنے والے عربوں کے مسائل کو پیش کیا۔

جن ادبا نے امریکہ ہجرت کی ان میں سرفہرست نام جبران خلیل جبران کا ہے، اس نے ''الاجنحۃ المتکسرۃ'' ''ٹوٹے ہوئے بازو پر)''، ''الارواح المتمردۃ'' (بھٹکتی ہوئی روح) میں عورتوں کے مسائل اور حقوق کے علاوہ دوسرے مسائل کا اظہار کیا، اس دور کے قصہ نگاروں میں یہ نام قابل ذکر ہیں۔

اب تک جن ناول نگاروں کا ذکر کیا گیا، بنیادی طور پر ان کے ناولوں کے کردار، پلاٹ،

مکالمے اور بندش میں وہ فنی خوبی اور چستی نہیں پائی جاتی ہے جو مغربی ناولوں میں ہے، بیسویں صدی کی ابتدا تک ناول کا یہ ابتدائی ارتقائی دور تھا جس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ قصہ اور ناول نگاری کا فن آہستہ آہستہ فنی پختگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

عربی ناول نگاری کی تاریخ میں محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸-۱۹۵۶ء) کا نام نہایت روشن اور تابناک ہے، وہ پہلا مصری ناول نگار ہے جس نے خالص فنی انداز پر ناول ''زینب'' فرانس کے قیام کے دوران لکھا، اس نے مصر کی دیہاتی زندگی کی تصویر کشی بڑے خوب صورت اور موثر انداز میں کی، اس کے ناول ''مناظر اخلاق ریفیۃ'' (دیہاتی مناظر اور اخلاق و کردار) میں ایک دوشیزہ کی محبت کی داستان ہے جو کھیتوں میں کام کرتی ہے، جاگیردار کے بیٹے سے ناکام محبت اور پھر اس کا غم اس کی زندگی کے خاتمہ کا سبب بن جاتا ہے، عام طور سے ناقدوں نے ''زینب'' کو پہلا فنی ناول قرار دیا لیکن بعض ناقدوں نے محمود طاہر حقی (۱۸۸۴-۱۹۶۴ء) کے ناول ''عذرا دنشوای'' (دنشوای کی دوشیزہ ۱۹۰۶ء) کو ''زینب'' کے ہم پلہ قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن کچھ اور نقادوں کی نظر میں عذرا دنشوای ابتدا اور ارتقا کی درمیانی کڑی ہے، غیر ملکی تسلط کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم کے قریب مصر میں وطن پرستی کا جذبہ تیزی کے ساتھ ابھرا، ۱۹۱۷ء میں بالفورس ڈیکلریشن جس میں فلسطین کی سرزمین پر یہودیوں کی آبادکاری اور حکومت کے قیام کی بات کی گئی، اس نے برطانوی سامراج کے خلاف زبردست نفرت پیدا کردی، دوسری طرف یورپ کی سازش اور اہل مغرب کی وطن پرستی کی تحریک نے عربوں کو خلافت اسلامیہ ترکی کی حکومت کے خلاف برسرپیکار کردیا، ان باتوں کا اثر صرف عوام پر ہی نہیں تھا، بلکہ دانش ور طبقہ بھی پیش پیش تھا، لازمی طور پر اس کا اثر ادب پر پڑا اور ناول نگاروں نے ان مسائل کو موضوع بنایا، یورپ اور اہل مغرب نے عثمانی حکومت کے خلاف جو زہر پھیلایا اس نے مذہبی اور دینی اقدار کے خلاف بھی ماحول پیدا کیا، علاقائیت اور وطنی جذبے کو بیدار کرنے کے لیے ناول نگاروں نے قدیم ثقافت اور تاریخ کا سہارا لیا، شامی ادیب معروف ارناوط نے چار تاریخی ناول لکھے، ان ناولوں میں حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی اور طارق بن زیاد فاتح اندلس سے متعلق دو ناول شامل ہیں، اسی طرح تونس کے ادیب البشیر خریف (متوفی ۱۹۱۷ء) نے ''برق اللیل'' (رات کی چمک) جیسے

ناول میں تونس کی سولہویں صدی کی تاریخ اور اہل اسپین کے تونس پر حملے کو موضوع بنایا، دوسرے ناول نگاروں نے ماضی پر فخر کرنے اور علاقائیت کے جذبہ کو عام کرنے کے لیے بڑی تعداد میں ناول لکھے۔

کچھ ناول نگاروں نے ماضی قریب کے سیاسی اور سماجی حالات اور واقعات کے پس منظر میں ناول لکھے، عراقی ادیب محمود احمد الصیاد (۱۹۰۳-۱۹۳۷ء) نے ۱۹۲۰ء میں ایک ناول ''جلال خالد'' لکھا، اس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق کے حالات اور غیر ملکی اقتدار کے خلاف بغاوت کے واقعات کو پیش کیا، توفیق یوسف عواد نے اپنے ناول الرغیف (روٹی، ۱۹۳۹ء) میں پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے خلاف عربوں کی مزاحمت کی تصویر کشی کی، شامی ادیب فارس زرزود نے اپنے ناول ''لن تسقط المدینۃ'' (۱۹۶۹ء) میں پہلی جنگ عظیم کی داستان اور دوسرے ناول ''حسن جبل'' (۱۹۶۹ء) میں فرانسیسی استعماری طاقت کے خلاف عوام کے جذبات و خیالات کی تصویر کشی کی۔

اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ رومانی ناولوں میں ''زینب'' پہلا ناول تھا، رومانی ناولوں کا سلسلہ عرب ممالک میں بھی شروع ہوا، الجیریائی ناول نگار احمد رضا ہوہو نے (۱۹۱۱-۱۹۵۶ء) ''غادۃ ام القری'' (شہر کی دوشیزہ) کے عنوان سے ناول لکھا، سوڈانی رومانی ناول نگاروں میں بدوی عبدالقادر خلیل کا نام ملتا ہے جس نے ''ھائم علی الارض و رسائل الحرمان'' کے نام سے ناول لکھا، اس کے علاوہ شاکر مصطفیٰ کا ناول ''حتی العود'' بھی اسی فہرست میں آتا ہے۔

مصر کی سرزمین پر زینب سے پہلے جرجی زیدان کے تاریخی ناول، صروف کے سماجی ناول اور منفلوطی کی جذباتی کہانیاں اور مویلحی کی کتاب عیسی ابن ہشام کے بعد محمود طاہر حقی کے ناول ''عذرا دنشوای'' کا ذکر آچکا ہے کہ اس ناول کی تخیل نگاری جس فنی بلندی تک پہنچی، اس سے پہلے کے ناول وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔

احمد حسین ہیکل کے بعد مصری ناول نگاروں میں ایک اہم نام محمد تیمور کا ہے، اس کا نامکمل ناول ''الشباب الضائع'' فنی اعتبار سے ''زینب'' کا ہم پلہ ہے، اس کے علاوہ عبید اور محمود تیمور

اور طاہر لاشین بھی اس زمانے کے قابل ذکر ناول نگاروں میں ہیں

مصری ناولوں میں محمد فرید ابو حدید کا ناول ''ابنۃ المملوک'' بھی اہمیت کا حامل ہے، گرچہ یہ ناول بھی تاریخی ہے لیکن جرجی زیدان کے مقابلہ میں کردار، پلاٹ اور بیانیہ کی سچائی کے لحاظ سے نمایاں ہے۔

بیسویں صدی کے دوسری دہائی کے اخیر تک ناول وقفہ وقفہ سے منظر عام پر آتے رہے، تیسری دہائی کے بعد سے یہ کثرت سے لکھے جانے لگے، طٰہٰ حسین کی ''الایام'' گرچہ سوانح ہے لیکن اس کے ناولانہ انداز سے اس کو ناول سمجھا جاتا ہے، اسی طرح العقاد جو ادیب، ناقد، فلسفی اور رومانی شاعر ہے اس کی کتاب ''سارہ'' فنی ناول کی تمام خوبیوں پر پورا نہ اترنے کے باوجود ناول ہی ہے، اس میں حقوق نسواں کے مسائل پر بحث کی گئی ہے، العقاد ہی کے قریبی دوست عبدالقادر المازنی گرچہ بڑے رومانی شاعر اور ناقد ہیں لیکن ان کا ناول ابراہیم الکاتب بھی اپنے انداز کا ایک منفرد ناول ہے جس میں ہیرو کی انا کی نفسیاتی تحلیل پائی جاتی ہے۔

''الایام'' والے طٰہٰ حسین نے یونانی تمثیل نگاری سے متاثر ہوکر نبی کریم ﷺ کی سیرت پر ''علی ہامش السیرۃ'' کے نام سے کتاب لکھی، اس کا انداز بھی کہانی کا ہے، بعض ناقدوں نے اس کو ناول میں شمار کیا ہے لیکن طٰہٰ حسین کے اصل ناول ''شجرۃ البؤس'' اور ''دعاء الکروان'' سمجھے جاتے ہیں، کردار نگاری اور اسلوب دونوں اعتبار سے یہ ناول اہم سمجھے جاتے ہیں، ان ناول نگاروں کے علاوہ توفیق الحکیم کو ڈرامہ نویس کی حیثیت سے عربی ادب میں ممتاز مقام حاصل ہے لیکن اس کے ناول ''عودۃ الارواح'' کو سماجی، وطنی اور قومی جذبات کا ترجمان سمجھا جاتا ہے، توفیق الحکیم کا دوسرا ناول ''عصفور من الشرق'' ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کردار متحرک انسان نظر آتے ہیں، اپنی محدود دنیا میں ایک آزاد دنیا کا تصور رکھتے ہیں اور ان میں مشرق کی روحانیت کی بہت خوب صورت عکاسی نظر آتی ہے اور یہی بات اس ناول کو دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتی ہے، توفیق الحکیم کا ایک اور ناول ''یومیات نائب فی الاریاف'' ہے (دیہات میں ایک سرکاری حاکم کی ڈائری) ایک قاتل کی تلاش اس ناول کا پلاٹ ہے، اس میں کاشتکاروں اور حکمراں طبقہ کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی پائی جاتی ہے، معاشرہ کے ان طبقات میں کیا تفاوت

ہے، فنی اعتبار سے اس کی عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔

محمود طاہر لاشین کا ناول (۱۹۳۴ء) ''حوا بلا آدم'' (حوا بغیر آدم کے) میں کردار کے جذبات اور عقل کی کشمکش کا نفسیاتی مطالعہ پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے اس ناول کو کردار نگاری کے میدان میں کامیاب ناول سمجھا جاتا ہے۔

سماجی، تاریخی اور سیاسی ناولوں ہی کے درمیان حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی کے رجحان نے ترقی کی، واقعیت پسند ناول نگاروں میں گرچہ نجیب محفوظ کا نام سرفہرست ہے لیکن عادل کامل کے ناول ''ملک الشعاع'' اور ''ملیم الاکبر'' کو بھی ناقدوں نے بہت اہمیت دی ہے۔

نجیب محفوظ نے تقریباً ۳۰ ناول لکھے، سو سے زائد افسانے اور ان کے علاوہ اور مضامین اس کے ادبی ذخیرے میں شامل ہیں، ۱۹۸۸ء میں نوبل انعام ملنے کے بعد سے ''الاہرام'' میں مختلف موضوعات پر کالم لکھتے رہے لیکن نوبل انعام کے بعد ان کا کوئی ناول وجود میں نہیں آیا۔

نجیب محفوظ کا پہلا ناول ''عبث الاقدار'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، اس سے پہلے ۱۹۳۸ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا، ۱۹۳۹ء سے مصر کے انقلاب کے سن ۱۹۵۲ء تک نجیب محفوظ نے تقریباً دس ناول لکھے، اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے نجیب محفوظ نے ناول لکھنا بند کردیا، نجیب محفوظ کے مشہور ناول ''القاہرۃ الجدیدۃ، زقاق المدق، بدایۃ ونہایۃ، خان الخلیلی، بین القصرین، قصر الشوق، السکریۃ، اللص والکلاب، السمان والخریف، الطریق، الشحاذ'' اور ''اولاد حارتنا، ثرثرۃ فوق النیل، میرامار'' ہیں، ان میں سے بیشتر ناولوں کے انگریزی، فرانسیسی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمے ہوگئے ہیں۔

نجیب محفوظ نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر کی شکست کے بعد سے ۱۹۷۲ء تک ناول نہیں لکھے بلکہ کہانیوں کی طرف توجہ دی، ان کی کہانیوں کے چار مجموعے ''تحت المظلۃ، خمارۃ القط الاسود، حکایۃ بلا بدایۃ ونہایۃ اور شہر العسل'' کے نام سے شائع ہوئے۔

نجیب محفوظ کو فلسفہ سے ہمیشہ دل چسپی رہی، تاریخی انداز کے ناول بھی لکھے، پھر

حقیقت نگاری کی طرف توجہ دی، اس کے بعد اس نے مابعد الطبیعیات کو اپنے ناول کا موضوع بنایا اور جو موشگافیاں کیں ان کو پسند نہیں کیا گیا۔

اس نے اپنے پہلے تاریخی ناول (عبد القدار) میں تقدیر کو موضوع بنایا اور بتایا کہ انسان کے لیے تقدیر ناگزیر ہے، اس سے فرار ممکن نہیں ہے، اس کے بعد کے دو تاریخی ناول رادوبیس (۱۹۴۳ء) اور کفاح طیبۃ (۱۹۴۴ء) جن کے کردار اور پلاٹ بہ ظاہر فرعونی دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن درحقیقت ان ناولوں میں مصر کے بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے حالات کو پیش کیا ہے، کردار اور پلاٹ سے غیر ملکی اقتدار اور وطنی وقومی جذبات کی کشمکش کی عکاسی بہ خوبی ظاہر ہوتی ہے۔

نجیب محفوظ کے پاس تاریخی ناول لکھنے کا ایک طویل خاکہ تھا لیکن بہت جلد ہی تاریخی ناول لکھنے کی بجائے اس نے اپنے قلم کا رخ حقیقت نگاری کی طرف موڑ دیا، مغربی ناول نگاری کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے حقیقت نگاری اور واقعیت کو اپنی تحریر کے لیے زیادہ مناسب سمجھا اور فکری طور پر حقیقت نگاری (Realism) کو اپنے فن کی بنیاد بنایا، چونکہ حقیقت نگاری کا مطلب تھا ادبی فن پارے میں گردوپیش کے حالات وعوامل، روزمرہ کے واقعات اور سامنے کی باتوں کو زیادہ سے زیادہ ”حقیقی“ شکل میں پیش کرنا اور خارجی طور پر زندگی کی جسمانی، مادی حرکات اور عمل کا اظہار کرنا، یہی باتیں ادب میں زندگی کا آئینہ دار سمجھی گئیں، نجیب محفوظ نے بھی گردوپیش کے حالات وعوامل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا لیکن قاہرہ کے سماجی طبقات کے خارجی جسمانی ومادی حرکات اور عمل کا اظہار اس انداز میں کیا کہ زندگی کی حقیقی روح کے عنصر کا وجود نظر نہیں آتا، نجیب محفوظ نے اس دور کے اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کے اظہار میں رومانی، جنسی، نفسیاتی، معاشرتی، علامتی اور اساطیری کیفیات کو اپنے کرداروں اور پلاٹ میں جگہ دی، وہ ناول جو نجیب محفوظ کی حقیقت نگاری کا مظہر ہیں اور قاہرہ کے مختلف محلوں اور طبقات کے افراد اور ماحول کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں ”خان الخلیلی، زقاق المدق، بدایۃ ونہایۃ اور القاہرۃ الجدیدۃ“، اس کے علاوہ وہ تین ناول جو نجیب کے ناولوں میں شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ثلاثیۃ Trilogy کے نام سے جانے جاتے ہیں وہ یہ ہیں ”بین القصرین،

قصر الشوق اور السکریۃ“، ان تینوں میں اس نے شہری زندگی کی ایسے انداز میں تصویر کشی کی کہ فنی اعتبار سے یہ ناول غیر معمولی ہوگئے اور خود نجیب محفوظ آسمان ادب پر درخشاں ستارہ کی مانند چمک اٹھا، ان ناولوں میں نجیب محفوظ نے اپنے فکر وفلسفہ کے مطابق قدامت پرستانہ رسم ورواج، فرسودہ اخلاقی ممنوعات سے پیدا ہونے والی گھٹن، بیزاری، طبقاتی سماج کی درندگی، کمزوروں اور مظلوموں کی مجبوری، جاگیردارانہ اور بورژوا سماج میں انسان کی بے وقعتی کو کمال فن سے پیش کیا ہے۔

نجیب محفوظ کو جس ناول ”اولاد حارتنا“ (ہمارے محلے کے بچے) کی وجہ سے نوبل انعام ملا، اس میں بھی قاہرہ کے قدیم محلہ کی زندگی کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں جسمانی ومادی تقاضوں کے باوجود زندگی کی اور کوئی علامت نظر نہیں آتی ہے۔

نجیب محفوظ نے ان ناولوں میں جس انداز سے قاہرہ کی زندگی اور گردوپیش کے انسان اور معاشرہ کو پیش کیا ہے وہ اہل مغرب کی حقیقت نگاری کے عین مطابق ہے، اس کی مثال اردو کے منٹو اور عزیز احمد کے ناولوں سے دی جاسکتی ہے جن میں فحش نگاری ہی کو حقیقت نگاری سمجھا گیا، جس میں اصل حقیقت کی تلاش اور معنویت بے معنی سی بات ہے۔

جس نے قاہرہ کو قریب سے دیکھا وہ سمجھ سکتا ہے کہ جس قاہرہ کی سرزمین پر جامع ازہر جیسا ثقافتی مرکز ہے اور اس کے اثرات جس طرح وہاں کی عوامی زندگی میں پائے جاتے ہیں، حقیقت اور معنویت کی تلاش میں نجیب محفوظ نے ان حالات اور عوامل کو بھی اپنے ناول کے کردار اور پلاٹ کے لیے منتخب کیا ہوتا تو شاید زیادہ حقیقت سے قریب تر ہوتے۔

مغربی ناقدوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ نجیب محفوظ نے مغربی انداز کی حقیقت نگاری کی طرف اس لیے توجہ دی کہ قاہرہ کی ادبی دنیا میں اپنا مقام بنانے کے لیے اس کو ایسا کرنا ضروری تھا، اعلا تعلیم کے حصول کے مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے قاہرہ کے اہل علم اور اعلا تعلیم سے آراستہ ادبا اور فن کاروں کے مقابلہ میں خود کو بلند کرنے کے لیے اس نے ناول کے فن پر بھرپور توجہ کی اور شک نہیں کہ اس نے فن، زبان اور اسلوب کے اعتبار سے اپنی ایک انفرادیت پیدا کی، اگرچہ ناقدوں نے اس کی زبان کی خامیوں پر گرفت کی ہے۔

۱۹۴۰ء کے اخیر میں جہاں حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی نے ترقی کی وہیں دوسرے ناول نگاروں نے معاصر واقعات اور حالات کو حقیقت نگاری سے الگ ہوکر محبت اور وقت کے تقاضوں کے انداز میں اپنے ناولوں کو پیش کیا، یوسف السباعی، محمد عبدالحلیم عبداللہ اور احسان عبدالقدوس اسی طرز فکر کے نمائندہ ناول نگار ہیں، عبدالحلیم عبداللہ (۱۹۱۳-۱۹۷۰ء) کے ناولوں کے کردار عام طور سے سماج کے نچلے اور غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں ذاتی قربانی کے جذبوں والے انسان کی ترجمانی پائی جاتی ہے اور ایسے کردار جو دیہاتوں سے شہر کی طرف تعلیم اور دوسرے مقاصد کے لیے منتقل ہوتے ہیں، ان کے احساسات کو اتنے موثر انداز میں اس نے پیش کیا ہے کہ وہ کردار مثالی بن گئے ہیں۔

یوسف السباعی (۱۹۱۷-۱۹۷۸ء) ناول نگاری کے میدان میں ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے ناول رومانوی ہیں، اس طرح قدامت پرستی اور قدیم اصولوں کی پیروی کے بجائے اس کے ناول کے کردار نئی دنیا کے وہ انسان ہیں جو خوشی کی تلاش میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، اس میں پاکیزگی کی ایک کیفیت بھی نظر آتی ہے "الحب العذری" (پاکیزہ محبت) عربی ادب کی قدیم روایت ہے، یہ روایت جدید انداز میں یوسف السباعی کے ناولوں میں نظر آتی ہے، مشاہدات کی ژرف نگاہی اور ایک رچی ہوئی حس، طنز و مزاح اس کے ناولوں کی خاص علامت ہے، ۱۹۴۸ء کی جنگ اور قیام اسرائیل کے واقعات کے بعد سے اس کے کردار اور ناول میں حب الوطنی کا جذبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

احسان عبدالقدوس (۱۹۱۹ء) عربی ناول نگاری کی تاریخ میں ایک قدآور شخصیت ہے، اس کے ناول زیادہ تر رومانوی ہیں، اس نے جذباتیت اور رومانیت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، بعض ناقدوں کا کہنا ہے کہ اس میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہے لیکن اس نے نوجوان نسل میں زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے جو جذبہ اپنے کرداروں کے ذریعہ ابھارا ہے وہ اس کے ناول کی اہم خصوصیت ہے، اسی لیے اس کے ناول بہت مقبول ہیں۔

مصر میں ۱۹۵۲ء میں انقلاب کے بعد سیاسی تبدیلی کے ساتھ ناول کے رجحان میں بھی تبدیلی آئی اور بعض وہ ناول جو انقلاب سے قبل لکھے گئے تھے انقلاب کے بعد زیادہ مقبول ہوئے،

اس لیے کہ یہ انقلاب کے بعد کے حالات کی غمازی کررہے تھے اور ان کے کردار بائیں بازو کے رجحانات سے ہم آہنگ تھے، محمد فرید ابوحدید کا ناول "ازہار الشوک" (کانٹوں کا گلدستہ) محمود تیمور کے ناول "نداء المجهول، کلیوباترا فی خان الخلیلی اور سلوی فی مهب الریح" اور "الی اللقاء ایها الحب" نے مقبولیت حاصل کی اور سماجی انصاف پر مبنی لویس عوض نے ناول "عنقاء" لکھا یحییٰ حقی کا "سب النوم" بھی اسی فہرست میں آتا ہے۔

اس انقلاب کے بعد خاص طور سے بڑا تغیر نئے لکھنے والوں کی تحریروں میں آیا، عبدالرحمان الشرقاوی (۱۹۲۰-۱۹۹۸ء) کے ناول "الارض" میں کسانوں کی زندگی اور اس کے مسائل سے بحث کی گئی تو عبدالرحمان الشرقاوی نے سماجی مسائل کو مادی شکل میں پیش کیا، لطیفہ الزیات نے "البلد المفتوح" میں مصر کے مستقبل کی رجائی تصویر پیش کی، اشتراکیت اور ترقی پسندی کی فکر اس ناول میں بڑی چابکدستی سے پیش کی گئی، یوسف ادریس کے ناول (۱۹۲۷-۱۹۹۰ء) بھی ترقی پسندی کا مظہر ہیں، اگرچہ اس کی شہرت زیادہ تر افسانے اور ڈرامہ نویسی کی وجہ سے ہے لیکن اس کے ناول میں قوت فکر اور مشاہدات کی جو باریکی پائی جاتی ہے کم ہی دوسرے ناولوں میں ملتی ہے، پلاٹ اور کردار اس کے اپنے ہیں، اس میں کسی کی نقالی نہیں ہوتی، اس کا پہلا ناول "قصة الحب" (۱۹۵۹ء) حب الوطنی کے جذبہ کی عکاسی کرتا ہے، دوسرا ناول "البیضا" (گوری، ۱۹۵۹ء) میں کردار کے نفسیات کا بہت اچھا تجزیہ ہے، یوسف ادریس کا سب سے اچھا ناول "الحرام" سمجھا جاتا ہے، اس ناول میں جس جسمانی اور مادی کردار کو پیش کیا گیا ہے، اس میں ایک عجیب سی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد بڑی تعداد میں نوجوان ناول نگار سامنے آئے، ان میں صنع اللہ ابراہیم کا نام سرفہرست ہے، اس کا ناول "تلک الرائحة" اور اسی طرح نعیم عطیة کا ناول "المراة والمصباح" نے خاصی شہرت حاصل کی، ان کے علاوہ محمد یوسف القائد، یحییٰ الطاہر عبداللہ اور عبدالحکیم قاسم نے بھی مصر کے دیہات کی تصویرکشی اشتراکی نظریے کی روشنی میں کی، ادوار الخراط کا نام بھی ناول نگاروں کی صف میں شامل ہے، اس کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس کے بیشتر ناول انسانی زندگی کے تجربات سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

غرض کہ عربی ناول نگاروں نے سماجی، اخلاقی، سیاسی، ثقافتی، تاریخی اور اجتماعی ناول لکھے، جو رجحانات عالمی ادب اور دوسری زبانوں کے ادب میں پائے جاتے ہیں، انہوں نے ان سے بھی استفادہ کیا، فلسطین کا مسئلہ عربی ناولوں کا ایک اہم موضوع ہے، بڑی تعداد میں ناول نگاروں نے اس موضوع کو اپنایا ہے، اس میں فلسطینی اور غیر فلسطینی سب ہی شامل ہیں، فلسطینیوں میں غسان کنعانی، امیل حبیب اور جبرا ابراہیم جبراء کے نام معروف ہیں، عربی ناول میں صرف اخلاقی زوال اور انسان کے مادی اور جسمانی حقائق کا اظہار ہی نہیں ہے بلکہ صحت مند افکار اور بامعنی اخلاقی اقدار اور انسان کے بلند اوصاف کے عناصر کی تصویر بھی ہے، اس سلسلہ میں نجیب الکیلانی، علی احمد باکثیر اور جودۃ السحار کا نام لیا جاسکتا ہے۔

عربی ناول میں تنقیدی اعتبار سے زبان اور اسلوب پر ناقدوں نے بہت کچھ لکھا ہے، بعض ناقدوں کی رائے یہ ہے کہ ناول کی زبان اور مکالمے کردار کے نفسیات اور اس کی تہذیبی سطح کے مطابق ہونا چاہیے، بعض ناقدوں کی رائے ہے کہ ناول کا فن چوں کہ ادب سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اس کی زبان اور مکالمے خالص ادبی شگفتہ انداز میں ہونے چاہئیں، اہل مغرب نے ہر طرح سے اہل مشرق کو اس کے صحت مند اقدار زندگی سے دور کرنے کی کوشش کی، مقامی زبان اور عامیہ جو پڑھنے لکھنے کی زبان نہیں ہے، اس کے استعمال کے لیے تحریک چلائی گئی اور اس تحریک کے سیلاب میں بڑے بڑے ادبا بہہ گئے، انہوں نے جواز پیدا کیا کہ نفسیات کے اعتبار سے زبان اور مکالمے کا استعمال ہونا چاہیے، انہوں نے ایسا کردار جو ناخواندہ ہے، عام دیہاتی ہے اس کے لیے عامیہ کے استعمال کو ضروری قرار دیا، یوسف السباعی، یوسف ادریس، توفیق الحکیم اور احسان عبدالقدوس نے کثرت سے عامیہ کا استعمال کیا، فنی اور ادبی لحاظ سے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ گرچہ مشکل ہے لیکن کسی بھی کردار کے نفسیات کے اظہار کے لیے عامیہ یا مقامی بولی ضروری نہیں بلکہ ادیب کی زبان پر قدرت اس سے سمجھی جائے گی کہ وہ موقع کے اعتبار سے کس طرح کی معیاری ادبی زبان استعمال کرتا ہے، نفسیات کا اظہار، طرز تکلم اور طرز ادا سے ہوتا ہے نہ کہ سطحی زبان کے استعمال سے۔

اقبال کے نظریۂ شعر کی روشنی میں چند معروضات

جناب محمد یحیٰ جمیل

ایک زمانے میں حسن عسکری نے ترقی پسند تنقید کے اس رویے کے خلاف آواز اٹھائی تھی کہ وہ ہر فن پارے کو سوشلسٹ طرز فکر پر پرکھتے ہیں اور اسی کو معیار بنا کر فیصلہ دیتے ہیں لیکن یہ طریقۂ کار صرف ترقی پسندوں پر موقوف نہیں رہا، دوسرے مکاتب فکر کے ادبا بھی تقریباً اسی رویہ پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔

اردو کے عظیم شاعر اقبال پر فن شاعری کی رو سے مختلف مقدمات قائم کیے جاتے رہے، یہی نہیں بلکہ الزام ثابت کر کے انہیں بارہا مجرم بھی گردانا گیا ہے، اس بات کو سمجھے بغیر کہ شعر و ادب سے متعلق سب کے اپنے نظریات ہیں اور اقبال کا بھی اپنا نظریۂ شعر ہے، لہذا عقل سلیم کا تقاضہ ہے کہ جب ہم اقبال کے کلام کا جائزہ لیں تو اسے اقبال ہی کے نظریہ سے پرکھیں، اپنے نظریہ سے نہیں۔

اقبال پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کو زمانہ ہوگیا، مثلاً یہ کہ وہ راہ نجات دکھانے میں اس قدر منہمک ہوجاتے ہیں اور اس کام کو اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ اکثر شاعری پس پشت ڈال دیتے ہیں، وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ اقبال کی نظر میں شاعری کی تعریف کیا ہے؟ کیا اقبال کے نزدیک بھی شاعری کی وہی تعریف ہے جو کلیم الدین احمد کے پاس ہے، ملحوظ رہے کہ سید صفدر "جدید شعری تنقید" میں کلیم الدین احمد کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان کے یہاں شعریت کی تفصیلی بحث نہیں ملتی، جہاں

لکچرر شعبہ فارسی، شریمتی کیشر بائی لاہوٹی مہاودیالیہ، امراوتی، ۴۴۴۶۰۳۔

وہ شعریت سے مملو حصۂ نظم کو سراہتے ہیں وہاں مثالیں صحیح دیتے ہیں مگر ان کی ناقدانہ توجیہ نہیں کرتے'' (۱)، بہرکیف مثالوں کی روشنی میں ان کے شعری نظریہ کی قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔

اقبال خود کو محرم رازِ درونِ مے خانہ کہتے ہوئے اپنی نوائے پریشاں کے شاعری ہونے سے انکار کرتے ہیں، اسے ہم شاعرانہ انکسار بھی سمجھ سکتے ہیں اور عالمانہ افتخار بھی، اس بنیاد پر عمارت کی تعمیر مناسب نہیں، اقبال کا نظریۂ شعر جاننے کے لیے ''تاریخ ادب عربی'' (۲) میں دیباچہ کے طور پر شامل ان کا مضمون ''جناب رسالت مآب ﷺ کا ادبی تبصرہ'' بڑی اہمیت رکھتا ہے، اقبال اس مضمون میں لکھتے ہیں:

''شاعری کیسی ہونی چاہیے اور کیسی نہ ہونی چاہیے، یہ وہ عقدہ ہے جسے جناب رسالت مآب ﷺ کے وجدان نے اس طرح حل کرلیا، امرؤالقیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے، روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر ﷺ نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی ''اشعر الشعراء قائدھم الی النار'' (یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان کا سپہ سالار بھی ہے)۔

......امرؤالقیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کردیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن، یہ کچھ ضروری نہیں کہ ایک ہی ہوں۔

......شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھادے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے......

ایک دفعہ قبیلہ بنوعبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول ﷺ کو سنایا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ حتی انال بہ کریم الماکل

(میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں، تاکہ اکل حلال کے قابل ہوسکوں)

رسول اللہ ﷺ جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند کرکے دکھائیں، اس شعر کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔ (۳)

اقبال یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:

''حضور خواجہ دو جہان ﷺ (بابی انت و امی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیات انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی......

......مصور فطرت کو اپنی رنگ آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لیے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے، یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دے کر چھین لی جائے، غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے وجدان حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح ارتقا کیا ہونی چاہیے''۔ (۴)

جب اقبال کا نظریۂ شعر ہی یہ ٹھہرا تو وہ اس اصول پر کس طرح پورے اتر سکتے ہیں کہ شاعری میں فنی برتاؤ کی اہمیت ہے، خیالات و افکار کی نہیں، اقبال، قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۳۷ھ) کی ''نقد الشعر'' میں کی گئی شعر کی اس تعریف کو اپنے کلام کے ذریعہ مسترد کرتے ہیں کہ طرز بیان شاعری کا اصل جزو ہے اور مضمون و تخیل کے بہ جائے خود فاحش ہونا شعر کی خوبی کو زائل نہیں کرتا (۵)، وہ ابن رشیق کے اس قول سے بھی متفق نہیں کہ ''شعر ذہنی نشاط نفس کا ذریعہ ہے جو دلوں کو گرماتا ہے اور روح کو تڑپاتا ہے، یہی شعر کا مقصد ہے اور اسی غرض سے اس کی تخلیق ہوتی ہے'' (۶)، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال مضمون شعر کو اہمیت دیتے ہوئے سپاٹ منظوم

بیان کو بھی شاعری سمجھتے ہوں، اقبال کے مطابق بھی:

حسین تر ہیں گل ولالہ فیض سے اس کے — نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اقبال کا اپنے اشعار میں شعری محاسن کا التزام کرنا، ان کے کلام میں اس کی ضرورت پر دلالت کرتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اردو کے مایہ ناز اور عظیم شاعر ہیں، انہوں نے فارسی سے ربط دے کر اردو ادب کو نئی زندگی بخشی ہے، لکھنؤ کے معروف شاعر پیارے صاحب رشید نے ایک شعری نشست میں اقبال سے ان کی نظمیں سننے کے بعد کہا تھا ''ایسی اردو نہ ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سنی ہے، حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو یا کوئی اور زبان'' (۷)، بات صرف اتنی ہے کہ اقبال معنوی لحاظ فحاشی، بے حیائی، کم ہمتی اور زندگی سے فرار کے مضامین کو شعر کا نقص سمجھتے ہیں، جب کہ دوسرے نظریہ شعر کے حامل ادبا اقبال سے متفق نہیں، مثلاً نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''فرض کیجیے ایک شخص حد درجہ فحش اور عریاں شاعری کا ذوق لے کر آیا ہے تو میں صرف فن کے لحاظ سے یہ دیکھوں گا کہ اس نے اس میں کس حد تک کامیابی حاصل کی'' ۔ (۸)

تو یہ نیاز کا اپنا معاملہ ہے لیکن اقبال کے کلام کو نیاز کے نظریے سے پرکھنا یا Abe Brenord کے اس قول کی روشنی میں کلام اقبال کا جائزہ لینا کہ Poetry should be and not mean یہ دیانت داری نہیں ہوگی کیوں کہ اقبال تو اس قاعدے کو تسلیم ہی نہیں کر رہے ہیں، لہذا نیاز کو نیاز کی دنیا میں رہنے دیا جانا چاہیے اور اقبال کو اقبال کی دنیا میں۔

اہم بات یہ بھی ہے کہ شاعری کی وہی تعریف نہیں ہے جو قدامہ، Abe Brenord یا نیاز فتح پوری کرتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شاعری کی مکمل اور منطقی تعریف ممکن ہی نہیں ہے، ہر زمانے میں شاعری کی مختلف تعریفیں ہوتی رہی ہیں، ہر دور میں، ہر زبان میں اس کے تصورات بدلتے رہے ہیں، عربی کے بلند پایہ شاعر نابغہ ذبیانی (۱۸ قبل ہجری) سے کسی نے پوچھا کہ ''اشعر الناس کون ہے؟''، اس نے جواب دیا ''من استجید کذبہ'' یعنی جس کا جھوٹ پسندیدہ ہو (۹) نظامی بھی کہتے ہیں:

در شعر مپیچ و در فن او — چوں کذب اوست احسن او

لیکن حضرت حسان بن ثابتؓ (متوفی ۵۴ھ) فرماتے ہیں:

وان اشعر بیت انت قائله — بیت یقال اذا انشدته صدقا

(یعنی اچھا شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں سچ کہا)۔

ایک گروہ ابہام کو شاعری کے لیے لازمی خیال کرتا ہے مگر قابوس نامہ میں عنصر المعالی کہتا ہے:

''ایسی بات جو تو جانتا ہے اور دوسرا نہیں جانتا اور اس کے سمجھنے کے لیے دوسرے کو شرح کی ضرورت پڑے نہ کہہ کیوں کہ شعر دوسروں کے لیے کہا جاتا ہے نہ کہ اپنے لیے'' ۔ (۱۰)

آج مابعد جدیدیت کا نظریہ ملاحظہ کریں:

اگر ہم جدید ترین شعریات کے اساسی اور بنیادی لسانی افکار کا جائزہ لیں تو معمولی سی بات بھی گہرائیوں میں اتر کر نئی معلومات سے لیس ہونے کی طرف راغب کرے گی اور زیادہ گفتگو متن اور متون کی سطح پر ہوگی اور محتویات، خیالات اور افکار کی بھی اپنی اہمیت ہوگی۔ (۱۱)

لہذا کلام اقبال کو سمجھنے کے لیے ان کا محولہ بالا مضمون کافی ہے جو ان کی شعری تنقید کو واضح کرتا ہے، اقبال اس خیال کے ساتھ تنہا نہیں ہیں کہ شاعری کا مقصد فائدہ پہنچانا ہے، نقصان نہیں، تاریخ ادب میں ایسے اور بھی ارباب نظر ہیں جو اقبال کے ہم خیال نظر آتے ہیں، یونانی شاعر و نقاد ہورلیس (۵۶ ق م - ۸۰ ق م) کے مطابق:

''شاعری کا مقصد یا تو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے یا دلچسپی پیدا کرنا ہوتا ہے یا پھر دلچسپی و مسرت کو زندگی کے مفید ادراک سے ملانا ہوتا ہے...... جو شخص مقصد اور دلچسپی کو ملا کر ایک کر دے، ہر شخص کا محبوب بن جاتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے قارئین کو ہدایت کے ساتھ ساتھ مسرت بھی پہنچا رہا ہے'' ۔ (۱۲)

رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ:

''اقدار عالیہ اور اقدار مطلقہ کا جواز اور دار و مدار انسان دوستی پر ہے، جس کے لیے ابتدائے تہذیب سے آج تک اچھے اور بڑے انسان کوشش کرتے رہے ہیں اور قربانی دیتے آئے ہیں، جب انسان کا معیار انسان اور انسانیت ہو

تو شعر و ادب کو بھی اس معیار سے پرکھنا چاہیے''۔(۱۳)

ایک فراسٹ بھی ہے جو کہتا ہے کہ Poetry begins in delight and ends in wisdom، اس لیے یہ اقبال پر انتہائی ظلم ہوگا کہ ہم جدید شعری تنقید کے پیش نظر اقبال کے خیالات سے چشم پوشی کرتے ہوئے صرف اور صرف ان کی شاعری کا مطالعہ کریں۔

اقبال کے نزدیک صحت مند معاشرے کی تشکیل اور اگر یہ نہیں تو کم از کم اس کی بچی کھچی قدروں کی حفاظت بہت اہمیت رکھتی ہے، وہ معاشرے کو گم راہ کرنے والے اور اسے پستیوں میں ڈھکیلنے والے ادب کو پسند نہیں کرتے، وہ قاری میں زندگی کے تئیں جوش و ولولہ اور صحت مند اقدار کو بیدار کرنا چاہتے ہیں، وہی بات جسے جدیدیت نے چنداں اہم نہیں سمجھا، آج اسے مابعد جدیدیت تسلیم کررہی ہے، وہاب اشرفی رقم طراز ہیں:

''......اردو مابعد جدیدیت کے سلسلے میں بعض امور قطعی واضح ہوچکے ہیں، ان میں جسے قطعیت حاصل ہے، وہ ہے انسانی زندگی کو ہر ممکن سطح پر مسرت آگیں اور ولولہ انگیز بنانا''۔(۱۴)

یعنی مایوسی اور شکستگی سے دور رکھنا۔

کسی فن پارہ کو پرکھنے کے لیے نقاد کو فن کار کا نظریہ جان کر، اس کی روشنی میں بحث کرنی چاہیے، یہ قول محل بحث ہوسکتا ہے کہ اس طرح نقاد، فن کار کے نظریے کا پابند ہوجائے گا، پھر اس کے اپنے نظریہ کا کیا ہوگا؟ کیا ''نقد الشعر'' کے لیے ذاتی رائے کو مقدم رکھنا چاہیے؟ اور اپنے تئیں اصول فن متعین کرنے چاہئیں؟ میں نہیں سمجھتا کہ فن کار نقاد کی ہدایات کے تحت ادب کی تخلیق کرتا ہے، لہٰذا نقاد کو ہدایات دینے کی ضرورت نہیں، فن کار کے نظریہ فن کو پیش نظر رکھنے سے واضح ہوجائے گا کہ ادب میں کاوش نگار کو اولیت حاصل ہے۔

مشہور ہے کہ ایک فن کار نے ہاتھی کی تصویر بنائی، جب اس کے استاذ نے وہ تصویر دیکھی تو اسے بتایا کہ تصویر یوں نہیں یوں ہونی چاہیے، فن کار نے استاذ کے حکم کے مطابق تصویر بدل دی، جب استاذ نے تصویر دیکھی اور اطمینان ظاہر کیا تو فن کار بولا ''استاذ ہاتھی تو بن گیا لیکن اس میں سے میں نکل گیا''۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر سید صفدر، جدید شعری تنقید، ۱۹۹۲ء، اچل پور، ص ۷ ۱۳۔ (۲) استاذ احمد حسن زیات، تاریخ عربی ادب (تلخیص وترتیب ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی)، الہ آباد، ۱۹۸۵ء۔ (۳) ایضاً ص ہ-و۔ (۴) ایضاً ص و۔ (۵) بحوالہ وقار احمد رضوی، نظرات، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۷۹۔ (۶) ابن رشیق، کتاب العمدہ، ج ۲، مصر، ۱۹۰۷ء، ص ۵۰۔ (۷) مکتوب اقبال، بہ تاریخ ۹ راگست ۱۹۲۳ء، اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۵۶۔ (۸) نیاز فتح پوری، فن تنقید، مطبوعہ ماہنامہ نگار، مشترکہ شمارہ جنوری وفروری، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۔ (۹) کتاب العمدہ، ص ۵۰۔ (۱۰) بحوالہ جدید شعری تنقید، ص ۹۱۔ (۱۱) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، مضمرات وممکنات، الہ آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷۶۔ (۱۲) ہوریس، فن شاعری مشمولہ ارسطو سے ایلیٹ تک، (مرتبہ ومترجمہ جمیل جالبی)، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۴۔ (۱۳) رشید احمد صدیقی، گنج ہائے گراں مایہ، ص ۲۰۸۔ (۱۴) مابعد جدیدیت، مضمرات وممکنات، ص ۱۸۵۔

اخبار علمیہ

سعودیہ کی ایک زیورساز کمپنی "النمار" نے اٹھارہ قیراط سونے اور بیش قیمت پتھروں سے دوکلووزنی طلائی قرآن تیار کیا ہے، اس پر پچیس لاکھ ریال خرچ ہوئے ہیں، کمپنی کے منیجر مصطفی النمار کے بیان کے مطابق اس میں آیات کا دوزبانوں میں ترجمہ بھی ہے لیکن رپورٹ میں نہیں ہے کہ ترجمہ کن کن زبانوں میں ہیں۔

جاپان میں قائم سائنسی و تحقیقی ادارہ ہیدو کے سربراہ ڈاکٹر مسارو وایموٹو نے نینوٹکنالوجی کی مدد سے آب زم زم پر تحقیق کرکے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ اس کے ایک قطرہ کو عام پانی کے ہزار قطروں میں شامل کرنے سے اس کے اندر آب زم زم کی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں، ان کی تحقیق کے مطابق زم زم کے ایک قطرے کا بلور (ایک چمک دار معدنی جوہر) کرۂ ارض کے دیگر کسی پانی کے قطرے کے بلور سے الگ ہوتا ہے، تجربہ کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ آب زم زم کی خصوصیات کسی طرح تبدیل نہیں کی جاسکتیں، اسی طرح عام پانی اور جس پانی پر بسم اللہ پڑھ کر دم کیا گیا تھا طاقت ور دوربینوں کے ذریعہ جب دونوں کا مشاہدہ کیا گیا تو بسم اللہ والے پانی کے ذرات میں خوب صورت بلور بن گئے تھے، اسی طرح جب قرآن مجید کی دوسری آیتیں پڑھ کر پانی میں دم کی گئیں تو عجیب قسم کا تغیر مشاہدے میں آیا، ایموٹو کا کہنا ہے کہ کرۂ ارض کی دوسری مخلوقات کی طرح پانی میں بھی ماحول کے مثبت و منفی اثرات قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اگر قرآن کی آیتیں پانی پر دم کرکے مریضوں کو پلایا جائے تو یقیناً انہیں شفا ہوگی، جاپانی سائنس داں کی یہ تحقیق صورت گجرات کے جناب خالد مینار صاحب نے معارف کو ارسال کی ہیں۔

حکومت آسٹریلیا نے سڈنی کے دیہی علاقہ کیمڈن میں مسلمانوں کو دینی تعلیمی ادارہ کے قیام کی اجازت اس لیے نہیں دی کیوں کہ وہاں کے انتہا پسند عیسائی اس کے خلاف احتجاج پر آمادہ ہیں، جب کہ مجوزہ اسکول کے درخواست دہندگان کا کہنا تھا کہ اس مدرسہ میں آسٹریلیا کے معیار تعلیم اور کیتھولک اور اینجلیکن روایت کو برقرار اور پیش نظر رکھتے ہوئے مسلم طلبا کے لیے دینی تعلیم کا نظم کیا جائے گا، مسلمانوں نے جیسے ہی حکومت کے سامنے یہ تجویز رکھی، جگہ جگہ مظاہروں اور احتجاج کی لہر چل

پڑی ہے، داخلہ کے خواہش مند طلبہ کو بھی دھمکیاں مل رہی ہیں، ایک خاتون کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے اسکول تو کیا کیمڈن میں ان کی بود و باش ہی ناقابل برداشت ہے، ایک شخص نے کہا کہ یہاں کیتھولک، بدھسٹ یا کسی ایسے اسکول کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جس میں ۱۲ سو طلبہ تعلیم پارہے ہوں، اس سے قومی مسائل پیدا ہوں گے، کونسل کو اسکول کی تعمیر کے حق میں سو اور مخالفت میں تین ہزار مکتوبات موصول ہوئے، حکومت کا کہنا ہے کہ اس بندش کی وجہ مذہب نہیں بلکہ قومی اور آمد و رفت کے مسائل ہیں، حکومت نے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ فیصلہ کیا ہے۔

امریکی رسالہ "گولف ڈائجسٹ" نے مئی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں سکھوں کے گرو ارجن دیوجی کی تصویر بہ حیثیت گولف کھلاڑی شائع کی تو امریکا میں قائم سکھ قومی حقوق تنظیم نے اس معاملہ کو رسالہ کے مدیر خصوصی اور صدر نشین جیری ٹارڈے کی میز تک پہنچادیا جس کے بعد انہوں نے سکھ برادران سے تحریری معذرت کے ساتھ اپنے ماتحت مرتبین کی غلطی پر اظہار افسوس کیا، ان کا یہ معذرت نامہ اگست کے شمارے میں شائع ہوگا، قابل غور بات یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی شعائر کی توہین پر اس قسم کی معذرت کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی جاتی؟

"کویت ٹائمز" میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ وہاں طب کے پیشہ سے وابستہ ایک خاتون سلمی الجاوی نے دنیا کی سب سے بڑی رنگ بھرنے والی کتاب تیار کی ہے، اس کی لمبائی ۱۸۰ سینٹی میٹر اور چوڑائی ۱۵۰ سینٹی میٹر ہے، اس میں کل ۱۵۰ صفحات ہیں، اس میں تصویریں اور اشاراتی اور معلوماتی جملے اس مقصد سے تحریر کیے گئے ہیں تاکہ بچے ان کو دیکھ اور پڑھ کر دانتوں کی صفائی اور حفاظت کی جانب خصوصی توجہ دیں اور برش کے استعمال کی افادیت سے واقف ہوسکیں۔

آسٹریلیا کے ۲۱ صحافیوں پر مشتمل ایک وفد نے زیر آب پریس کانفرنس میں حصہ لے کر عالمی ریکارڈ بنانے کا دعوا کیا ہے، یہ کانفرنس دو آسٹریلیائی مصنفین کی مشترک کتاب کے رسم اجرا کے لیے منعقد کی گئی تھی جس کو گنیز بک میں شامل کیا گیا تھا، یہ صحافی غوطہ خوروں کے لباس میں ملبوس Traun جھیل میں ۱۶ فٹ اندر تھے اور ان کو بحث و مباحثہ کی رپورٹ لکھنے کے لیے واٹر پروف قرطاس و قلم بھی دیے گئے تھے۔

انسانوں کی قوت یادداشت جانوروں سے بہتر سمجھی جاتی ہے لیکن جاپانی سائنس دانوں کی حالیہ تحقیق اور تجربہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ چمپنزیوں کی قوت یادداشت انسانوں سے بدرجہا بہتر

ہے، سائنس دانوں نے چمپنزیوں کا مقابلہ یونی ورسٹی کے طالب علموں سے کیا، مقابلہ میں شریک چمپنزیوں کو پہلے ایک سے نو تک گنتی سکھائی گئی، پھر دونوں کا امتحان لیا گیا، اس امتحان میں اسکرین پر تحریر شدہ گنتیوں کے مقام کو یاد رکھنا تھا اور پھر یادداشت کے سہارے انہیں دوبارہ ترتیب دینا تھا، چمپنزیوں نے طلبہ کے بہ نسبت جواب جلد اور صحیح دیے۔

یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن نے ۳۰ جامعات اور ۳۷۰ کالجوں کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے، ان میں چند یونی ورسٹیاں عالمی معیار کی ہوں گی، گیارہویں پنج سالہ منصوبہ کے تحت موجودہ تعلیمی اداروں کی ترقی و فروغ کے لیے جو اقدامات پیش نظر ہیں، ان کو عمل میں لانے کا مقصد ۱۸ سے ۲۳ برس کی عمر کے طلبا کی تعداد میں ۲۰۱۲ء تک ۱۰ سے ۱۵ فیصد تک اضافہ کرنا ہے، رپورٹ کے مطابق ۱۶ مجوزہ یونی ورسٹیوں کے لیے خاکے اور مسودے تیار کیے جاچکے ہیں اور بقیہ عالمی معیار کی ۱۴ یونی ورسٹیوں کے لیے کمیٹی بنادی گئی ہے، مذکورہ بالا کالجوں کے لیے مفصل منصوبہ سازی آخری مرحلے میں ہے۔

امریکا کی یونی ورسٹی آف ٹیکساس کے ماہرین طب نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ دل کی بیماری کے حملہ کے بعد وہ مریض تیزی سے رو بہ صحت ہیں جنہوں نے مثبت انداز میں سوچنے اور اپنا کام آزادانہ طور پر خود ہی انجام دینے کو ترجیح دی ہے، اس طرز عمل سے صحت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوتے ہیں، ڈاکٹروں نے ۸۲۳ دل کے مریضوں کا جن کی عمر ۵۰ سے زیادہ تھی جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ بیماری سے مایوس افراد کے مقابلہ میں وہ مریض زیادہ رو بہ صحت ہیں جو مثبت انداز سے سوچتے ہیں اور اس مرض کا مقابلہ ہمت سے کرتے ہیں۔

جاپانی کار کمپنی ہونڈا نے ہائیڈروجن گیس اور بجلی سے چلنے والی گاڑی بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے، اس کار کا نام "الف سی ایکس کلیرٹی" تجویز کیا گیا ہے، اس گاڑی سے صرف آبی بخارات خارج ہوں گے، کسی دوسری زہر آلود گیس کا اخراج اس سے نہیں ہوگا، موجودہ ذرائع یعنی ڈیزل اور پٹرول سے چلنے والی عام کاروں کی بہ نسبت اس پر تین گنا کم خرچ آئے گا، کمپنی شروع میں صرف دو سو کاریں تیار کرکے عاریۃً خواہش مندوں کو دے گی کیوں کہ اس کار کے لیے مطلوب ایندھن فراہم کرنے والے اسٹیشنوں کی قلت ہے۔

ک۔ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

شعبہ اسلامک اسٹڈیز،
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
علی گڑھ۔
۲۰۰۸/۵/۸ء

برادر مکرم پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب (مدیر "معارف" اعظم گڈھ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے لیے مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی بے لوث خدمات اور بے مثال قربانیاں بہ خوبی معروف ہیں، شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں مولانا کی یاد میں منعقدہ تعزیتی نشست کے موقع پر آپ نے بجا فرمایا تھا کہ "دارالمصنفین کے لیے مولانا کی خدمات مثالی رہی ہیں، انہوں نے ایک دو یا چند برس نہیں بلکہ اپنی عمر عزیز کے پورے پچاس سال اس ادارہ کی خدمت کے لیے وقف کیے"، اس لیے مناسب ہوگا کہ ان کی یاد میں "معارف" کا خاص نمبر شائع کیا جائے، یہ ان کے لیے بہترین خراج عقیدت ہوگا، مولانا مرحوم پر مضامین و دیگر تحریروں سے ان کی علمی، دینی و تحقیقی خدمات کے بہت سے پوشیدہ گوشے سامنے آئیں گے اور ان کے اعلا کردار، اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ کے مزید نمونے واضح ہوجائیں گے، ان کی شخصیت کے دونوں پہلو بہر حال وجہ عبرت و نصیحت ہیں۔

مولانا مرحوم کی وفات کے بعد دو سوالات اکثر سامنے آتے تھے، ان کا جانشیں کون ہوگا، ان پر معارف کا خاص نمبر شائع ہوگا کہ نہیں؟ یہاں علی گڑھ میں بھی بہت سے حضرات مولانا پر خاص نمبر کے بارے میں استفسار کرتے رہتے ہیں، پہلے سوال کا اطمینان بخش جواب سب کے سامنے آچکا ہے، امید کہ غور و فکر اور مشورہ کے بعد دوسرے سوال کے جواب سے بھی قارئین معارف، مولانا کے قریبی متعلقین اور بہی خواہان دارالمصنفین کو مطمئن فرمائیں گے۔ والسلام

طالب خیر،

ظفر الاسلام اصلاحی

مکتوب ممبئی

ڈونگری کلینک
۲۴۔ جیل روڈ،
ڈونگری، ممبئی
۱۲؍جون ۲۰۰۸ء

محترم جناب عبدالمنان ہلالی صاحب

آج آپ سے فون پر گفتگو ہوئی!

گذشتہ شب معارف کے ذریعہ یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ محترم جناب ضیاء الدین اصلاحی کا انتقال ۲؍فروری کو ایک سڑک حادثے میں ہوگیا، مجھے یہ خبر بڑی تاخیر سے ملی۔

میں ان کو برابر خط لکھتا اور فون کرتا رہتا تھا، مارچ اپریل میں میں ممبئی سے باہر رہا، مرحوم کے متعلقین اور پس ماندگان کو میری جانب سے تعزیتی کلمات پہنچا دیں، موت ناگزیر حقیقت ہے، کون اس کو چیلنج کرسکتا ہے لیکن ایک عالم، امت کے قائد اور دانشور کی وفات ملک و قوم کا سب سے بڑا خسارہ ہے، مولانا مفکر، مصنف، محقق اور داعی تھے، معارف کے ذریعہ انہوں نے ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مسلمانوں کے معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی مسائل پر شذرات کے ذریعہ قیمتی افکار و خیالات کا اظہار کیا، معارف میں ان کی ادارت میں بہترین مقالات و مضامین شائع ہوتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

ڈاکٹر عبدالکریم نائک

مکتوب عمر آباد

جامعہ دارالسلام،
عمر آباد
۲۱؍مئی ۲۰۰۸ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا حافظ عمیر الصدیق ندوی صاحب، زید مجدہ
(مدیر معاون ماہنامہ "معارف") السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خیریت حاصل و مطلوب!

فروری ۲۰۰۶ء میں Social Education Foundation اعظم گڈھ کی طرف سے

ایک مقابلہ میں میرے مجموعہ کلام "نغمات حمد و نعت" کو انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا تھا، مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے اپنے دست مبارک سے "ایوارڈ" کے سلسلہ میں سند توصیف اور گیارہ ہزار روپے کا چیک مجھے عنایت فرمایا تھا، مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی سے دوسری مرتبہ شرف ملاقات حاصل کرنے اور ان کے مبارک ہاتھوں سے ایوارڈ کا اعزاز حاصل ہونے پر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی تھی، مولانا سے میری پہلی ملاقات جامعہ دارالسلام عمر آباد میں اس وقت ہوئی تھی جب کہ مولانا کو ہمارے جامعہ کے سالانہ اجلاس میں خطبہ تقسیم اسناد کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

مارچ ۲۰۰۸ء میں میں زیارت حرمین کے سفر سعادت پر تھا، تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد جب عمر آباد واپس پہنچا تو یہ دردناک اطلاع ملی کہ مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی کار کے حادثے میں جاں بحق ہوکر اللہ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مولانائے مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں ٹھکانہ بخشے، کار کے حادثۂ فاجعہ کے ذریعہ مولانائے مرحوم نے داعی اجل کو جو لبیک کہا ہے یہ خود بھی ایک طرح شہادت کی موت ہے، جس کی بہ دولت اللہ تعالیٰ کفارۂ سیئات کے علاوہ مولانا کے لیے ان شاء اللہ رفع درجات کا فیصلہ کریں گے، میں مولانائے مرحوم کے پس ماندگان سے تعزیت ادا کرتے ہوئے آپ تمام وابستگان دارالمصنفین کی خدمت میں بھی تعزیتی کلمات پیش کررہا ہوں، چوں کہ میں مولانا کی وفات حسرت آیات کے موقع پر سعودی عرب میں تھا، اس لیے کسی قدر تاخیر سے تعزیت نامہ ارسال خدمت کررہا ہوں۔ والسلام

آپ کا مخلص
ابوالبیان حماد عمری

مکتوب دہلی

جامعہ ریاض العلوم،
اردو بازار، جامع مسجد، دہلی
۲۰۰۸/۵/۱۰ء

گرامی قدر مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب، زاد حبکم و لطفکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

مخدوم گرامی محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب تغمدہ اللہ برحمتہ وجعل الجنۃ مثواہ
کے حادثہ جانکاہ کی اطلاع مجھے میرے چھوٹے بھائی مسعود احمد نے اخبار پڑھ کر بہ ذریعہ فون دہلی دی، سن کر میں دہرے رنج میں ڈوب گیا، فون سے رابطہ کرکے تعزیت کی، مگر دل مضطرب و بے چین تھا، دراصل میں ان دنوں اپنے ایک لڑکے (محمد رابع ربیع، ۱۵سال) کو لے کر ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل تھا، جو تشویش ناک حالت میں تھا، بخار دماغ تک چلا گیا تھا، جس کا علاج ہنوز جاری ہے، مولانا اصلاحی کے ناگاہ حادثہ کی خبر نے مجھے مزید رنج وغم میں ڈبو دیا، خط کے ارسال میں تاخیر ہوئی، انشاء اللہ چھٹی میں بہ غرض تعزیت حاضر خدمت ہوں گا۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی معیت میں جو دن گزرے تھے بے حد قیمتی تھے، آج بھی ان کا سراپا، روشن آنکھیں، کتابی چہرہ، متوسط قامت، بھرپور سفید داڑھی، تواضع وانکساری، شفقت ومحبت کا مجسمہ، فکر ونظر کی بلندی، صوم وصلاۃ کی پابندی، خوش خلقی ووضع داری نظروں میں گھوم رہی ہے، ان کی خاموشی طبع میں علم کا دریا موج زن تھا، ہمیشہ دارالمصنفین کے استحکام کی فکر میں ڈوبے رہتے، مولانا مرحوم سے میرا تقریباً بیس پچیس برسوں کا تعلق تھا، ہمیشہ محبت وشفقت سے پیش آتے، ایک بین الاقوامی ادارہ کے ناظم ہونے کے باوجود علمی تمکنت ورعب کا کوئی شائبہ نہیں تھا، اب ایسے مخلص وبے نفس وقناعت پسند بہت کم ملتے ہیں، ان کا اچانک حادثہ نہ صرف ادارہ واہل خانہ کا سانحہ ہے بلکہ قومی وملی عظیم خسارہ ہے، اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

والسلام
عبدالمبین ندوی

دارالمصنفین کا سلسلۂ مکاتیب

وفیات

آہ! مولانا پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی مرحوم

افسوس کہ گذشتہ ماہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ، ایک اور نمایاں اور قابل قدر ہستی کی خدمات سے محروم ہوگئی، خبر آئی کہ مشہور عالم، عربی اور اردو کے ممتاز صاحب قلم مولانا پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی نے ۲۰ رجون کو دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون -

مولانا مرحوم ہمارے علما کے اس طبقے سے تھے جن کی تعلیم وتربیت خالص دینی بنیادوں پر استوار ہوئی لیکن جن کے فیضان نظر سے عصری تعلیم کے ادارے بھی بہرہ ور ہوئے اور جنہوں نے اپنے علم وعمل سے جدید دانش گاہوں میں صرف دینی اداروں کی عظمت وتوقیر میں ہی اضافہ نہیں کیا بلکہ اس مذہبی حمیت و غیرت اور خالص دینی تشخص کی پاسداری، بڑی استواری سے کی جس کا اولین سبق انہوں نے اپنے والد ماجد مولانا سید محمد مصطفیٰ سے حاصل کیا تھا، ان کے والد ضلع بستی میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی دعوت اور طرز تربیت میں اپنے جد امجد سید جعفر علی نقوی کے جانشین تھے، جن کو امام شہیدؒ کی قربت ومعیت حاصل تھی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق کا مبارک اثر ان کے پورے خاندان پر رہا، جس کی وجہ سے والدین نے بچپن ہی سے اسلامی واخلاقی کہانیاں سنا کر اور خود اپنے عمل سے ایسی ذہن سازی کی کہ آئندہ زندگی میں وہ جہاں بھی رہے، راہ حق وجادۂ اعتدال سے ذرا منحرف نہیں ہوئے، دارالعلوم ندوۃ العلما کے بعد انہوں نے دمشق یونی ورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے سندیں حاصل کیں اور طالب علمی کے بعد معلمی کا دور جامعہ ملیہ اسلامیہ، کشمیر یونی ورسٹی اور الہ آباد یونی ورسٹی میں پورا کیا، پروفیسر ہوئے، صدر شعبہ ہوئے، اس کے علاوہ درمیان میں کچھ وقفہ مدینہ منورہ وریاض وجدہ میں بھی گزارا، روایت اور جدیدیت کی عام کشمکش سے دوچار ہوئے لیکن وہ ہر حال میں ان ہی اقدار کے امین ومحافظ رہے جو ان کو پہلے گھر اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلما سے حاصل ہوئی تھیں، دارالعلوم میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کے تعلق میں خاندانی پس منظر کے ساتھ خود حضرت مولانا کی غیر معمولی توجہ وشفقت ان کی داستان حیات کا سب سے روشن باب ہے حضرت مولانا ندویؒ پر ان کی عربی کتاب دارالقلم دمشق سے شائع ہوئی اور یہ مرشد ومسترشد کے رشتہ عقیدت کی بہترین ترجمان ہے، مصروف ترین تدریسی زندگی کے باوجود انہوں نے تصنیف وتالیف سے رشتہ ہمیشہ قائم رکھا،

ان کی کتابوں کی فہرست میں حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی کارنامے، نواب صدیق حسن خاں علمی و ادبی کارنامے، تاریخ فکر اسلامی، عورت اسلام کی نظر میں، حقوق انسانی اسلامی شریعت میں، جدید عربی شاعری، جدید معاصر، شامی ادب، التعبیر والمحادثۃ العربیہ اور نقوش تابندہ ان کے قلم کی روانی اور ان کے ذہن وفکر کی جولانی شاہد ہیں، نقوش تابندہ میں انہوں نے انتساب ''ان تمام اسلام پسند حضرت، خواتین اور مراکز کے نام کیا جو دنیا کو از سرنو اسلام کے زیر سایہ سکھ چین عطا کیے جانے کے لیے کوشاں ہیں'' اس انتساب میں ان کے دل کا تمام افسانہ سمٹ آیا، وہ اسلام کی سربلندی کے آرزومند اور اس کے لیے ہر جگہ کوشاں رہے۔

گذشتہ سال ماہ جون میں خوش قسمتی سے ان کے ساتھ بھٹکل میں ہفتہ عشرہ گزارنے کا موقع ملا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت کو دیکھنے، سمجھنے اور ان سے استفادے کی یہ فرصت بڑی بیش قیمت رہی، ان کے علم پر یقین تھا کہ وہ استاذ الاساتذہ تھے لیکن ان کے فضل پر دل سے ایمان وہیں نصیب ہوا، انکسار، فروتنی، سادگی، مروت، تحمل اور خورد نوازی کا ہر نقش کامل سے کامل تر نظر آیا، زندہ دلی اور بلند پایہ حس مزاح نے قدم قدم پر ان کے اخلاق کی بلندی و پاکیزگی کے نقوش ثبت کردیے، انہوں نے بھٹکل کے اس سفر اور قیام کی روداد ''تعمیر حیات'' میں جس بے ساختگی سے لکھی وہ ان کے قلم کی جادو بیانی ہوگئی، قلم کے ساتھ ان کی خطابت بھی کم نہ تھی، سادہ، بے تکلف اور دل سے نکلی ہوئی بات، سیدھے سامعین کے دلوں تک جا پہنچتی، وہ ندوۃ العلما کی مجلس شوریٰ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کی مجلس تعلیمی اور رابطہ ادب اسلامی کے معزز رکن تھے، صدر جمہوریہ ہند نے ان کی عربی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا تھا، حق یہ ہے کہ وہ ان اعزازات سے بھی بلند تر تھے، دارالمصنفین اور رسالہ ''معارف'' سے قلبی تعلق تھا، ان کے کئی مضامین رسالہ ''معارف'' کے صفحات کی زینت بنے، ''عربی زبان کے ارتقا میں حدیث نبوی کا ارتقا'' اپنے موضوع پر بہترین مضمون تھا، ایسا ہی ایک مضمون ''ہندوستان میں عربی ادبیات'' کے عنوان سے تین قسطوں میں شائع ہوا، اپنے موضوع پر حددرجہ جامع مضمون اس لائق ہے کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے، ان کی وفات سے جو علمی نقصان ہوا ہے دارالمصنفین اور معارف کو بھی اس کا احساس ہے، یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک سرشت بندے کی نیکیوں کو قبول فرما کر آخرت میں ان کے درجات بلند فرمائے گا، اس دنیا میں بہرحال ان کے قدرشناس مدتوں رویا کریں گے۔

فخلوا کلامی ان الح بی البکا   فان فراق الصالحین عسیرٌ

ع۔ص

ادبیات

نذرانۂ عقیدت

جناب ضیاء الرحمان اعظمی

اے تو کہ ترا دم تھا چمن زار سراپا   تو مہر و محبت کا تھا بازار سراپا
آداب و شرافت کا تھا شہکار سراپا   اک پیکر اخلاق تھا، کردار سراپا
تھی جوئے گلستاں سے بھی شیریں تری آواز
تھا ہم کو ترے حسنِ متانت پہ بڑا ناز

یوں علم اور تحقیق کی وہ بزم سجائی   شبلی کدہ کی اور بھی کچھ شان بڑھائی
اسلاف کی ہم کو نئی تصویر دکھائی   اب تک نہ سنی تھی جو کبھی بات، سنائی
تقریر تری نازشِ اربابِ سخن تھی
تحریر تری جلوۂ صد رشک چمن تھی

اب کون بتائے گا ہمیں کام کی باتیں   افلاک سے آئے ہوئے احکام کی باتیں
اب کس سے سنیں گے عرب و شام کی باتیں   صحراؤں میں بیتے ہوئے ایام کی باتیں
ماضی کے شفق زاروں میں لے جائے گا اب کون
اللہ کے شہ پاروں کو دکھلائے گا اب کون

سینے میں تری یادوں کا پیکان چھپائے   جان و جگر میں درد کا طوفان چھپائے
کیا کیا نہ دل زار میں سامان چھپائے   حسرت کو سمیٹے ہوئے، ارمان چھپائے
ہم یاد کریں گے تجھے ہر دم ضیاء صاحب
کرتے رہیں گے آنکھیں سدا نم ضیاء صاحب

۹۴۔ چکلہ تکیہ، اعظم گڈھ۔

آہ! مولانا ضیاء الدین اصلاحی

ڈاکٹر ابرار اعظمی*

عجیب شخص تھا وہ بھی ، خدا کی رحمت ہو

ضیاء دین و دنیا ، شعاع علم یقیں
عمل تھا رشک خلائق کہ فکر دیں تھی حسیں
وہ شبلیؒ اور سلیمانؒ کا جانشین لئیق
زبان ہو کہ ادب ، فن شعر یا تحقیق
خدا کا عبد حقیقی ، نبیؐ کا گرویدہ
پرستش اور عقیدت کا فرق فہمیدہ
وہ انکسار و تواضع ، وہ نرمئ گفتار
سراپا اسوۂ نبویؐ ، نگہ میں پیار ہی پیار
لہو کے پھول تھے رخ پر ، نشاں شہادت کے
لبوں پہ عکسِ تبسم ، بیاں طمانت کے
نگہ بلند ، دل دردمند رکھتا تھا
جگر کے خون سے وہ حرفے چند لکھتا تھا
اک ایسا عالم دیں ، دین جس پہ خود نازاں
اک ایسا انساں کہ انسانیت بھی تھی فرحاں
سبھی کے قلب حزیں سے نکل پڑی ہے آہ!
''اکیڈمی'' کہ فلاح ، یا مدرسۃ الاصلاح
خدایا ، عفو و کرم ان پہ عام کردینا
بکھرتی قوم کو نعم البدل عطا کرنا

عجیب شخص تھا وہ بھی ، خدا کی رحمت ہو

* سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن، خالص پور، اعظم گڈھ، ۲۷۶۱۳۸۔

مطبوعات جدیدہ

مکتوبات ماجدی (جلد چہارم): از مولانا عبدالماجد دریابادی، مرتبہ: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۴، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ادارہ انشائے ماجدی، ۷، ۱۴۷-رابندر سرانی، کولکاتا-۷۳۔

مکتوبات ماجدی کی گذشتہ تین جلدوں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، اب اس چوتھی جلد میں تیس شخصیتوں کے نام قریب چار سو خطوط جمع کیے گئے ہیں، مکتوب الیہم میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی عتیق الرحمان عثمانی، مولانا شاہ غلام محمد، مولانا جمال فرنگی محلی، مولانا محمد اشرف خاں اور ڈاکٹر غلام دست گیر رشید جیسی مذہبی ہستیاں ہیں تو ملا واحدی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، نیاز فتح پوری، شوکت تھانوی، محمد طفیل صاحبِ نقوش، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، افضل اقبال جیسے ادیب و محقق اور حیات اللہ انصاری، شورش کاشمیری، انیس احمد عباسی وغیرہ جیسے صحافی بھی ہیں، دارالمصنفین کے مولانا مسعود علی ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمان کے نام بھی خاصے خطوط ہیں، مولانا کے مکتوبات اور ان کی علمی و ادبی اور اصلاحی شان کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے، خطوط کی شکل میں علم و حکمت کے ان آب دار موتیوں اور ادب و انشا کے جواہر پاروں کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش یقیناً قابل تحسین ہے، مولانا دریابادی کے وقت اور کام میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی برکت رکھی، ان کی تفسیر، تصنیفات، سچ اور صدق کے بے شمار مضامین اور موضوعات کے تنوع کی طرح ان کے علمی روابط کا دائرہ بھی نہایت وسیع تھا، ان کے پاس جس کثرت سے خطوط آتے تھے اس کے لیے کثرت کا لفظ ناکافی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جن خطوط کے جواب انہوں نے منتخب شکل میں محفوظ رکھے صرف ان کی تعداد گیارہ ہزار کے قریب ہے، نصف صدی سے زیادہ کے عرصے پر محیط یہ خطوط اپنے عہد کی تاریخ کے کئی گوشوں کے لیے مستند دستاویزوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخ بہر حال خوش گوار اور ناخوشگوار دونوں قسم کے واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے، زیر نظر مجموعہ مکتوبات میں خاصا ذکر دارالمصنفین اور اس کے احوال و مسائل کا ہے اور اس میں

بھی مولانا سید سلیمان ندوی کے تعلق کا حصہ غالب ہے، مولانا مسعود علی ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمان اور حضرت سید ندوی کے داماد سید حسین ایڈیشنل کمشنر کے خطوط کے علاوہ مولانا شاہ غلام محمد کراچوی صاحب تذکرہ سلیمان کے نام مکتوبات بھی دراصل ذکر سلیمان ہی پر مشتمل ہیں، یہ خطوط نہایت دل چسپ ہیں، شاہ غلام محمد کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ ”سید صاحب کی مستند سیرت جب نکلے گی تب نکلے گی، آپ کا سا عاشق وشیدائی تو اسے لکھ بھی نہیں سکتا، ہمدرد و عاشق میں بڑا فرق ہے“ سید صاحب کا تعلق خانقاہ تھانہ بھون سے ہوا تو ان کے بعض معتقد معترض ہوئے، مولانا دریابادی نے اس کے متعلق لکھا کہ ”میں اس گروہ کا ہرگز ہم خیال نہیں بلکہ سید صاحب کا ربط تھانہ بھون سے قائم کرنے میں تو خود ساعی رہا، باقی جس حد تک سید صاحب اس رنگ میں چلے گئے یعنی علمی تحقیق کو از کار و اشغال صوفیہ میں فنا کردیا، اس پر مجھے تاسف ہی ہوتا رہا“، مولانا تھانوی صاحبِ مکتوبات کے مرشد تھے اور نہایت محترم و محبوب لیکن محبت و عقیدت کی فراوانی کے باوجود مولانا کا مزاج ہمیشہ حد اعتدال ہی میں رہا، ایک جگہ لکھا کہ ”حضرت تھانوی کی انتہائی عظمت کے باوجود میرا یہ عقیدہ نہیں کہ ان کی تفسیر کا ہر لفظ قرآن سے متعلق آخری لفظ ہے، یہ رتبہ کسی بھی مفسر قرآن کا نہیں ہوسکتا، قرآن ہر بڑے سے بڑے مفسر سے بھی بڑا ہے“ اور مولانا کا یہی وصف کیا ان کی سیرت اور ان کے قلم کے تمام اوصاف یعنی حق گوئی، خیر خواہی، دل جوئی کے ساتھ غلطیہائے خیال و مضامین پر ان کی گرفت، ان خطوط میں پوری طرح جلوہ گر ہیں اور انشائے ماجد کی رعنائیاں ان سب پر مستزاد، ہر خط میں ایسے جملے ایک نہیں کئی کئی ہیں جن کو شاہکار نمونوں کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، اردو کے بہترین گیارہ شاعر کون ہیں؟ حیرت شملوی کے اس سوال پر مولانا نے لکھا کہ ”بہ ظاہر معصومانہ سوال حقیقتاً سخت ہے“ لیکن مولانا کی اس منتخب فہرست میں علامہ اقبال کا نہ ہونا اسی طرح حیرت انگیز ہے جس طرح مرزا ہادی رسوا کا ہونا، مکتوبات پر حاشیے پہلے کی تین جلدوں کی طرح فاضل مرتب کے قلم سے ہیں، کتاب کا سب سے کمزور پہلو اس کی کتابت کی غلطیاں ہیں، شاید ہی کوئی صفحہ ہو جو اغلاط اور فاش اغلاط سے خالی ہو، کثرت سہو سے مطالعہ کا لطف جاتا رہتا ہے، کاش اس پر خاطر خواہ توجہ دی جاتی، ترتیب کی بھی کمی ہے، زمانی یا تہجی یا کسی اور ترجیحی ترتیب سے قارئین کو زیادہ آسانی ہوتی اور اگر نئی جلد میں گزشتہ جلدوں کے مکتوب الیہم کی فہرست شامل کی

جاتی تو چند صفحات کا یہ اضافہ شاید اور مفید ہوتا۔

دیوان حاتم (انتخاب دیوان قدیم): شیخ ظہور الدین حاتم، مرتب: پروفیسر عبدالحق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۷۸، قیمت: ۴۰۰ روپے، پتہ: ۲۳/۱۵، ہڈسن لائن، کنگس وے کیمپ، دہلی ۱۱۰۰۰۹۔

برسوں پہلے کلام حاتم کے انتخاب کے ایک نادر مخطوطے کی دولت بے بہا کی بہ دولت، فاضل محقق نے زیر نظر کتاب کو مرتب کر کے شائع کیا، شیخ حاتم کی دولت کے ظہور سے اردو زبان و شاعری کے قدرداں فیض یاب بھی ہوئے اور اس حقیقت سے بھی واقف ہوئے کہ حاتم متقدمین میں صرف ایسا ایک عام نام نہیں جس نے دبستان دہلی کی تشکیل میں حصہ لیا بلکہ ان کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ ملک بلکہ عالم میں دھوم مچانے والی ایک نئی زبان کی ساخت وشناخت کے اولین معماروں میں سرفہرست ہیں، حاتم کے دیوان نے ان کو شمالی ہند میں اردو کے پہلے صاحب دیوان کا درجہ دیا اور اس مفروضے کو بھی صاف کیا کہ ولی دکنی کی دہلی آمد سے یہاں شاعری کا آغاز ہوا، فاضل محقق و مرتب، ایوان شاعری میں صرف اقبال کے نقیب ہیں لیکن حاتم کے کلام کی خوبیوں اور اس کی معنویت کی تہہ داریوں نے اور اس سے بڑھ کر حاتم کی سادہ و پرخلوص شخصیت کے قلندرانہ مزاج نے ان کو حاتم کا سخن فہم طرف دار بنادیا، پیش نظر کتاب میں قریب ایک سو پچیس صفحات میں پیش گفتار کے عنوان سے اسی اجمال کی تفصیل ہے اور اس شان کی ہے کہ اس میں شخصیت اور شاعری کا ایک گوشہ بھی تشنہ نہیں رہا، تذکرہ نگاروں کے بیانوں کے تضاد کی وضاحت حاتم کی وکالت کے پہلو بہ پہلو، جگہ جگہ نظر آتی ہے، اس میں سنین کے اختلاف، مطابقت، تصحیح اور ترجیح میں محققانہ ژرف نگاہی اور دیدہ ریزی، تحقیق کے طالب علموں کے لیے مثال سے کم نہیں کہ جس کی تقلید کامیابی کی کلید ہے، حاتم کی شاعری کے متعلق یہ خیال برحق ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسروں کی زمین کی پیداوار ہے، کتاب میں قریب پچیس شعرا کی زمین میں ۸۰ غزلوں کی نام بہ نام نشان دہی کی گئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حاتم کے دیوان زادہ میں چار ہزار اشعار ہیں جس کی وجہ سے ان کو اپنی شاعری پر ناز تھا گو تذکرۂ قدرت کے بہ قول ”ان کے اکثر اشعار لطف سے خالی ہیں“ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے فصیح اور روزمرہ کی اہمیت کو محسوس کر کے اردو کو دہلی

کے محاورے کے مطابق بنانے کی کوشش کی اور یہ بجائے خود ایک کارنامہ اس لیے ہے کہ ان کے کلام ہی سے قدیم وجدید کے امتیازات اور ان میں تغیر وانحراف کا پتہ چلتا ہے، حاتم کی شاعری کے رطب ویابس پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، تحقیق کے ساتھ بلند پایہ تنقید کی یہ آمیزش بڑی خوش گوار اور پرلطف ہے، خاتمہ کلام پر فاضل محقق ونقاد کی یہ رائے محض تاثراتی نہیں کہ "حاتم اردو ادب پر ابر کرم بن کر برسے اور زمین سخن کو ایسی شاداب نمی اور قوت نمو دے گئے جو ہر دور کے سرمایہ شعری کو نئی تخلیق وتحریک سے گراں بار کرتی رہے گی"، پیش گفتار کے بعد انتخاب دیوان حاتم کی غزلیں، متن، اختلاف متن اور مختلف نسخوں سے مطابقت کی تصریحات کے ساتھ دی گئی ہیں، اردو کے تحقیقی ادب میں حاتم کی طرح یہ کتاب بھی صف اول کی امتیازی شان رکھتی ہے، کلام حاتم گو بعضوں کے نزدیک لطف سے خالی ہو لیکن اس خوان حاتم میں لطف ولذت کی کمی نہیں۔

تصفیۃ القلوب ملقب بہ شفائے دل: از مولانا محبوب احمد قمر الزماں ندوی الہ آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۶۰، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ دار المعارف، بی/۶۳۹، وصی آباد، الہ آباد، یوپی ۲۱۱۰۰۳۔

نیت وعمل کے اخلاص، علم کی فضیلت، امراض دل، ذکر الٰہی، دعا، درود وسلام، نماز، صبر، زہد، شکر، توکل، خوف الٰہی، دنیا اور توبہ جیسے موضوعات پر مشتمل مباحث کا مقصد واضح ہے کہ نفس کا تزکیہ اور اخلاق کی اصلاح ہو، مضامین جب علامہ ابن رجب حنبلی، ابن القیم جوزی اور امام ابوحامد غزالی کے افکار والفاظ میں ہوں تو ان کی تاثیر اور سوا ہوجاتی ہے، اس کتاب کے لائق مترجم نے اسی تاثیر اور افادیت کے پیش نظر کتاب تزکیۃ النفوس کو اردو میں منتقل کیا، اردو ترجمہ بھی بہت مقبول ہوا، ہمارے پیش نظر کتاب طبع ثانی ہے جس میں پہلے ترجمہ کے بعض مقامات کو اور سلیس ورواں کیا گیا ہے، مزید خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں لائق مترجم کے نامور والد جناب مولانا قمر الزماں نے اخلاق مذمومہ کے عنوان سے قریب سو صفحات پر مشتمل ایک نہایت مفید اور کار آمد مضمون کا اضافہ کردیا، ریا، حرص وطمع، اظہار عبارت، نخوت وتکبر، خود پسندی، حسد، غصہ، تن پروری، بخل اور حب مال ومدح، فضول گوئی، غیبت جیسے اخلاقی اور روحانی امراض کی تشخیص اور ان کا مداوا، انہوں نے بڑے موثر انداز میں پیش کردیا، اخلاق محمودہ کے ساتھ اعمال مذمومہ کی اس وضاحت وتفصیل سے

کتاب کا فائدہ بھی دو چند ہوگیا، دار المعارف ایک عرصے سے اس قسم کی کتابوں کی اشاعت کا نیک فریضہ انجام دے رہا ہے، اس میں یہ نیت بھی شامل ہے کہ اسلام کے اصل اور حقیقی تصوف کی صحیح ترجمانی ہوسکے، خانقاہ وصی اللّٰہی کا امتیاز بھی یہی تھا، آج کے بیمار معاشرے کو شفائے دل جیسے نسخہ کیمیا کی ضرورت ہے، توقع ہے کہ اس کتاب سے یہ ضرورت خاطر خواہ پوری ہوگی۔

خاقانی شروانی، حیات وشاعری: از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۶۰، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: رحیم اسٹورس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگ پور، مہاراشٹر۔

علم وادب کے ایک خاموش شیدائی اس کتاب کے لائق مصنف ہیں، انہوں نے ودربھ کے علاقے میں رہ کر اردو زبان وادب کی خدمت مستقل مزاجی سے کی اور ان کی علمی یکسوئی داد کے لائق ہے کہ اب تک ان کی قریب ۲۶ کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہوچکی ہیں، زیر نظر کتاب بھی ان کے مطالعہ کی وسعت اور تنوع کی مثال ہے جس میں انہوں نے چھٹی صدی ہجری کے عظیم فارسی شاعر کے حالات، شاعری اور شاعرانہ محاسن وخصوصیات کا جائزہ لیا ہے، عام تذکرہ نگاروں کی طرح انہوں نے صرف مدح پر اکتفا نہیں کیا مثلاً خاقانی کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ان کی نخوت اور پندار کا بھی ذکر ہے کہ اس نے اپنے محسن استاذ ابوالعلا گنجوی کی ہجو لکھی اور اس میں نہایت فحش اور رکیک زبان استعمال کی، انہوں نے لکھا کہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان دونوں کے درمیان اختلاف کے کیا اسباب تھے؟ لیکن ایک سبب تو یہی تھا کہ خاقانی بادۂ نخوت سے چور تھا، شخصیت کے علاوہ خاقانی کی شاعری بے داغ ہے، قصیدہ گوئی میں وہ طرز خاص کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی کہ اس کی تقلید کسی اور سے نہ ہوسکی، خاقانی کی شاعری پر بحث گو زیادہ مفصل نہیں لیکن یہ تشنہ بھی نہیں ہے، ساحل صاحب کا اسلوب بھی شائستہ اور شستہ ہے، البتہ فارسی اقتباسات اور اشعار کا ترجمہ نہ سہی، مختصر اردو خلاصہ، عام قارئین کے لیے بھی کتاب کو زیادہ پرکشش بنانے میں معاون ہوتا، ساحل صاحب آنکھوں کی تکلیف اور کم روشنی کے باوجود علم وتحقیق کی خدمت میں مصروف ہیں، یہ واقعی ہمت مردانہ ہے اور ڈاکٹر مدحت الاختر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ان کی ہمت قابل صد ستائش ہے۔

"LET US SPEAK COLLOQUIAL ARABIC العربية بين الفصحیٰ والعامية": از جناب محمود حافظ عبدالرب مرزا، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۰، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: اکیڈمک ایکسیلنس، ۴۲، ایکتا اپارٹمنٹ، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱۔

غیر عرب، عربی دانوں بلکہ عربی زبان و ادب پر دسترس رکھنے والوں کا جب عرب ملکوں میں وہاں کے مقامی لب و لہجہ اور طرز تعبیر و ادا سے سابقہ ہوتا ہے تو قدم قدم پر افہام و تفہیم میں دشواری کا سامنا کرنا ہوتا ہے، اگر یہ پوچھنا ہے کہ آج دوکانیں کیوں بند ہیں تو لماذا المحلات مغلقة اليوم کا جملہ ہی درست ہے لیکن اس کی جگہ لیش الدکاکین صاکه اليوم؟ کا تصور نہیں کیا جاسکتا لیکن فصیح اور عوامی بولی کا یہ فرق ہر زبان کے ساتھ ہے، اس کتاب میں اس قسم کے بے شمار جملے اور محاورے جمع کیے گئے ہیں اور اس کا مقصد بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ عرب ماحول میں صرف مبتدیوں کے لیے ہی نہیں، ان لوگوں اور خاص طور سے ان منتہی طلبہ کی سہولت کے لیے بھی ہے جو عرب میں اعلا تعلیم کے لیے جاتے ہیں، کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے، لسانیاتی اعتبار سے بھی اس کا مطالعہ بہت دل چسپ ہے کہ حرف استفہام ما کیسے اش / وش میں بدل جاتا ہے، تفضل بالدخول کی جگہ تفضل خش کہنے کی خوشی کیسے ملتی ہے، فون، سڑک، ہوٹل، اسکول، آفس، بازار، بینک، پوسٹ آفس، ٹیکسی، بس، ریلوے اور ہوائی اڈے، پولیس، ہنگامی حالات غرض ہر جگہ اور ہر موقع کے لیے فصحیٰ اور عامیہ دونوں تعبیرات کو انگریزی جملوں کے ساتھ پیش کردیا گیا ہے، ضروری چیزوں کے نام اور بعض پرلطف محاورے بھی دیے گئے ہیں، نوجوان مولف اس ضروری اور مفید کام کے لیے موزوں بھی تھے کہ ان کا بچپن اور لڑکپن سعودی عرب میں گزرا لیکن انہوں نے جس سلیقہ سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے، اس سے ان کے بہتر تصنیفی مستقبل کی توقع کی جاسکتی ہے اور اس کا ہلکا سا اندازہ ان کے دیباچے سے کیا جاسکتا ہے لیکن کتاب کی قیمت نسبتاً زیادہ ہے۔

ع - ص